تعلیم و تربیت

ماں نمبر

اپریل 1998ء

قائدِ اعظمؒ کلاسک چودھویں قسط

سچی کہانی ایک دلچسپ سلسلے کا آغاز

ہالی را اور مامتا ایک شکاری کی کہانی

مجاہدینِ آزادی

چیف ایڈیٹر: عبدالسلام
ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام
مشیر: سعید لخت
سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر: ڈاکٹر رضوان ثاقب
خصوصی مشیر: محمود حسن رومی
اسسٹنٹ ایڈیٹر، پرنٹنگ: سید شوکت اعجاز
سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

خوش خبری

ماں نمبر کی اشاعت کے موقع پر
بچوں کے ایوارڈ یافتہ مصنف
نعیم احمد بلوچ
کے دل چسپ سلسلے
"سچی کہانی"
کا آغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Madiha Moazzam

السلام علیکم و رحمتہ اللہ!

اس مہینے بڑی عید، عید الاضحیٰ آ رہی ہے...... ہماری طرف سے پیشگی عید مبارک۔

تعلیم و تربیت کا ماں نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے یہ آپ کو پسند آئے گا۔ ہمیں ضرور بتائیں کہ "ماں نمبر" کو ایک یادگار شمارہ بنانے میں ہم کہاں تک کام یاب ہوئے ہیں؟

اب تو آپ کے امتحانوں کا نتیجہ بھی آ چکا ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کو اپنی محنت کا صلہ کام یابی کی صورت میں ملا ہو گا۔ کیوں کہ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اپنی کام یابی کے بارے میں ہمیں ضرور لکھیے۔

سلسلہ وار ناول تو ہمارے خیال میں گرمیوں کی چھٹیوں سے ہی شروع ہونا چاہیے تاکہ آپ فارغ وقت میں خوب مزے لے لے کر پڑھ سکیں۔ البتہ آپ کے لیے ایک خوش خبری یہ ہے کہ ہم اس ماہ سے بچوں کے ایوارڈ یافتہ مصنف نعیم احمد بلوچ صاحب کا ایک دل چسپ سلسلہ "سچی کہانی" شروع کر رہے ہیں۔ یقیناً یہ آپ کو پسند آئے گا۔ آپ کے پسندیدہ سلسلے "دل چسپ اور ناقابلِ یقین" اور "کھیلوں کی دنیا" اس ماہ خاص نمبر کی وجہ سے شائع نہیں ہو رہے۔ آیندہ ماہ سے باقاعدگی سے شائع ہوں گے ان شاء اللہ۔ اڈیٹر۔

اپریل
1998ء

پرنٹر: عبدالسلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم لاہور

سرورق: ایک قابلِ تقلید ماں

قیمت فی پرچہ =/15 روپے
(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

اس شمارے میں

[illegible] 1
ماں کا محبوب (سچی کہانی) نعیم احمد بلوچ 2
[illegible] (اردو ادب) سید عقیل حسین 3
[illegible] (نظم) شمیم حیدری 6
[illegible] (کہانی) سید نظری [illegible] 7
[illegible] 12
[illegible] محمد [illegible] 13
ماں کا کرشمہ (سائنس فکشن) حسن ذکی کاظمی 24
امی کی خواہش (کہانی) اشفاق احمد خان 29
عید (کہانی) قلیل ناہید 32
ایک قابلِ تقلید ماں ڈاکٹر رضوان ثاقب 36
کارٹون کہانی شاہد ریاض شاہد 40
دادی جی کی آزمائش 42
ماں کا پیار (نظم) محسن علی محسن 44
شرارتی لکیریں شاہد ریاض شاہد 45
عظیم ماؤں کے شہ پارے سیدہ طیبہ ہاشمی 46
ہونہار مصور 56
نئی امی (ڈراما) سلیم خان گمی 57
ماں کا سایہ (نظم) حفیظ الرحمان احسن 66
بالی را اور ماسٹر (کہانی) عبدالستار خان طاہر 67
بلاعنوان کارٹون 72
باقی سب دل چسپ سلسلے حسبِ معمول

سالانہ قیمت
پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے
مشرق وسطیٰ افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =/690 روپے
یورپ (ہوائی ڈاک سے) =/770 روپے
امریکہ، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) =/890 روپے

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 شارع بن بادیس، لاہور
فون: 6278815-6278816-6361309-6361310

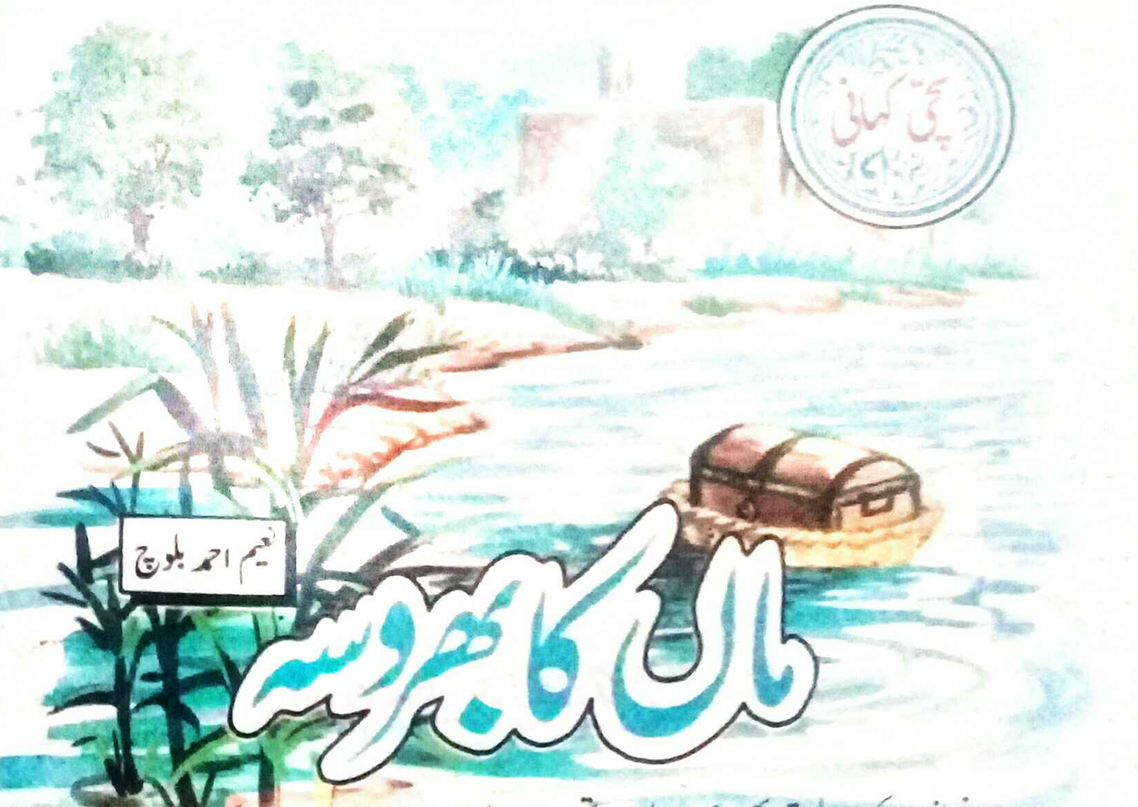

ماں کا بھروسہ

نعیم احمد بلوچ

انسانوں کی یہ بستی بھی عجیب بستی تھی۔ اس بستی میں رہنے والوں سے زیادہ ظلم شاید ہی کسی پر ہوا ہو! اس کا بادشاہ بہت ظالم تھا' اس بادشاہ نے جو قانون بنا رکھا تھا' اس سے پہلے وہ قانون کسی بادشاہ نے نہیں بنایا تھا۔ یہ کہانی اسی عجیب اور مظلوم بستی کے ایک گھرانے کی ہے اور اس کا ایک ایک لفظ بالکل سچا اور حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ کہانی ایک ماں کی کہانی ہے۔ جس کا نام "یوکبد" تھا۔ یوکبد کے ہاں جب ایک بیٹی اور ایک بیٹے کے بعد تیسرا بچہ پیدا ہوا تو وہ خوش ہونے کے بجائے سخت خوف زدہ اور پریشان تھی۔ اس کی پریشانی کی وجہ وہ خوف ناک قانون تھا جو اس بادشاہ نے بنایا تھا۔

اس قانون کے مطابق اس کی بستی میں رہنے والے لوگوں کے ہاں جو بھی بیٹا پیدا ہوتا اسے قتل کردیا جاتا۔ بادشاہ کی جاسوس عورتیں بستی میں پھرتی رہتیں' انہیں جیسے ہی کسی کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی خبر ملتی فوراً ظالم بادشاہ کے سپاہیوں کو خبر کر دیتیں اور وہ معصوم بچے کو قتل کر دیتے۔

یوکبد کو بھی یہ پریشانی تھی کہ وہ بیٹے کو ظالم بادشاہ کے سپاہیوں سے کیسے محفوظ رکھے۔ اس کے شوہر جس کا نام عمران تھا' نے اپنے طور پر اس کا انتظام کر رکھا تھا کہ کسی کو یہ خبر نہ ہو کہ ان کے ہاں بیٹے نے جنم لیا ہے لیکن یوکبد اپنے شوہر سے کہتی کہ ہم کب تک اس کو چھپائیں گے۔ جس دن ظالم بادشاہ کو اس کی خبر پہنچی اسی دن وہ میرے اس خوب صورت اور روشن آنکھوں والے بچے کو لے جائیں گے۔ وہ دن رات اپنے بچے کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہتی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا اسی قدر ان کے دل میں یہ خوف پیدا ہو رہا تھا کہ نہ جانے کب ظالموں کو خبر ہو جائے اور وہ بچے کو مارنے پہنچ جائیں۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے جب یوکبد اپنے پیارے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر اللہ سے اس کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی کہ اسے محسوس ہوا جیسے اس سے کسی نے سرگوشی کی ہے۔ یوکبد نے اردگرد دیکھا لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اکیلی ہی بیٹھی تھی۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ میرا وہم ہو لیکن اسے دوبارہ آواز سنائی دی۔ اس مرتبہ آواز اتنی صاف اور واضح تھی کہ اسے کسی قسم کا شک نہ رہا۔ واقعی کوئی اس کا نام لے رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ کہ اے یوکبد' جب تمہیں بچے کے معاملے میں خطرہ محسوس ہو' تو اسے ایک صندوق میں ڈال کر دریا میں چھوڑ دینا' دریا اسے کنارے پر دھکیل دے گا اور پھر ہمارا وعدہ ہے کہ اس بچے کو محفوظ بھی رکھیں گے اور یہ تمہاری ہی گود میں پرورش پائے گا۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔

یوکبد اللہ پر یقین رکھنے والی ماں تھی۔ اسے یقین ہوا کہ اس سے یہ سرگوشی کسی اور نے نہیں بلکہ اللہ نے کی ہے اور اپنے دل کے ٹکڑے کو صندوق میں رکھ کر دریا میں بہا دینے کا حکم کسی اور نے نہیں بلکہ اللہ نے دیا ہے تو اس

نے فوراً اس حکم کی تعمیل کا ارادہ کر لیا۔ اس نے اپنی بڑی بیٹی مریم کو اپنا ہم راز بنایا اور اس کے ساتھ مل کر لکڑی کا ایک صندوق لیا۔ اس پر اچھی طرح روغن کیا تاکہ پانی سے لکڑی خراب نہ ہو۔ پھر اپنے خوب صورت بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے صندوق میں ڈالا اور بیٹی سے کہا کہ اسے خاموشی سے دریا میں بہا آؤ۔

یہ ایک ماں کا اللہ پر بھروسہ ہی تھا جس نے اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے پیارے بیٹے کو دریا میں بہا دے۔ اسے اللہ پر مکمل یقین تھا لیکن پھر بھی اس کے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ معلوم نہیں ان کا معصوم بیٹا دریا میں بہتے ہوئے کہاں جائے گا۔ اس لئے اس نے اپنی بیٹی مریم سے کہا کہ بیٹی ذرا دیکھنا یہ صندوق جاتا کہاں ہے؟۔

بیٹی کو روانہ کر کے وہ اللہ سے اپنے بیٹے کی سلامتی کی دعا مانگنے لگی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ انتظار کرنے لگی کہ اس کی بیٹی مریم کب واپس آتی ہے تاکہ وہ اس سے پوچھے کہ صندوق دریا میں بہانے کے بعد کدھر گیا ہے۔

اس کا انتظار طویل ہوتا گیا۔ یوکبد سخت بے چین تھی کہ آخر اس کی بیٹی واپس کیوں نہیں آئی۔ کبھی یہ وہم دل میں پیدا ہوتا کہ کہیں بادشاہ کے کسی سپاہی نے تو اسے صندوق دریا میں بہاتے نہیں دیکھ لیا۔ وہ سوچتی کہ اگر ایسا ہوا تو سپاہی بچے کو تو قتل کریں گے ہی وہ مریم کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن پھر اسے اللہ کا وعدہ یاد آیا اور مایوسی کے اندھیروں میں امید کا چراغ جل اٹھا اور وہ اللہ سے مخاطب ہوئی "اے اللہ مجھے تمہارے وعدے پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ لیکن کیا کروں' میں ایک ماں بھی ہوں۔ دل بار بار وہموں اور وسوسوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتا ہے"۔

کئی گھنٹوں کے صبر آزما انتظار کے بعد اس کی بیٹی مریم ہانپتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ ماں اس کے چہرے پر لکھی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ مریم نے سرگوشی سے کہا "ماں تیار ہو جاؤ' آپ میرے ساتھ' بادشاہ کے محل میں جا رہی ہیں!"

ماں کا دل دھک سے رہ گیا۔ بولی! "کیا بیٹے کو بچانے کی کوشش کرنے کے الزام میں مجھے سزا ملنے والی ہے؟"۔

"نہیں ماں ..... دراصل میرا بھائی بادشاہ کے محل میں ہے!" مریم نے رازداری سے کہا۔ یہ خبر پہلی سے بھی زیادہ پریشان کن تھی۔ وہ فوراً بولی "تو میرا بیٹا بادشاہ کے محل میں ..... یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا انہوں نے تمہیں صندوق کو دریا میں ڈالتے دیکھ لیا تھا ....؟"۔

"نہیں ماں ایسی بات نہیں۔ میرا بھائی محفوظ ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ تمہارا بیٹا اور میرا بھائی ہے .... اللہ نے میرے بھائی کی حفاظت کی ہے ....."

یوکبد سے اب مزید صبر نہ ہوا۔ وہ بولی "بیٹی مجھے پوری بات بتاؤ۔ مجھ میں تو اب سوال پوچھنے کی بھی ہمت نہیں رہی۔ ساری بات تفصیل سے بتاؤ کیا ہوا؟"

مریم نے کہا "ماں جب میں نے تمہارے کہنے پر صندوق کو دریا میں بہا دیا تو مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ میں صندوق کو دریا میں بہا کر چھپ کر دیکھتی رہی اور پھر تھوڑے فاصلے سے دریا کے کنارے کنارے چلنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ صندوق بادشاہ کے محل کی طرف جا رہا ہے۔ میں بہت پریشان ہوئی اور جب میں نے صندوق کو محل کے عین سامنے کنارے لگتے دیکھا تو ایک طرف چھپ کر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد محل سے سرکاری محافظ آئے اور صندوق کو دریا سے نکال کر محل میں لے گئے۔ میں بھی کنیز کے روپ میں محل کے اندر چلی گئی۔ محل میں موجود دوسری کنیزوں نے مجھے بتایا کہ محل کی چھت سے ملکہ نے ایک صندوق کو دریا کے کنارے لگے دیکھا تو اس کو پانی سے باہر نکلوایا اور کھول کر دیکھا تو اس میں ایک خوب صورت بچہ تھا۔ بچہ ملکہ کو بہت پسند آیا۔ ملکہ چوں کہ بے اولاد ہے اس لئے وہ اسے گود لینے کا سوچ رہی ہے۔

کچھ دیر مزید گزری تو یہ خبر مشہور ہوئی کہ بادشاہ نے بچے کو قتل کرنے کا حکم دے دیا ہے"۔

یوکبد نے جب یہ واقعہ اپنی بیٹی کی زبانی یہاں تک

سنا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مگر بیٹی نے دلاسا دیا اور کہا "ماں" آپ مت روئیں .... اللہ نے کرم کیا اور پھر بادشاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا"!

"وہ کیسے بیٹی؟ اس سنگ دل میں یہ رحم کیسے آیا؟"

"دراصل بادشاہ جتنا ظالم ہے، اس کی ملکہ اتنی ہی رحم دل ہے .... اس نے بادشاہ کو سمجھایا کہ میں اس بچے کو گود لینا چاہتی ہوں۔ میں اس کی پرورش محل ہی میں کروں گی، اس لیے یہ بڑا ہو کر ہمارا دشمن نہیں، دوست ہو گا۔ بادشاہ نے پہلے تو انکار کیا لیکن ملکہ بضد رہی اور پھر نہ جانے بادشاہ کے دل میں کیا آئی کہ اس نے ملکہ کو اجازت دے دی"۔

یوکبد نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ وہ اللہ کی قدرت پر حیران ہو رہی تھی کہ اس نے کیسے دشمن کے دل میں رحم پیدا کیا۔ مریم نے مزید بتایا "ماں، صرف یہی نہیں، اللہ کی کرشمہ سازی تو یہ ہوئی کہ میرے بھائی نے اچانک رونا شروع کر دیا"۔

"ظاہر ہے بیٹی، اسے بھوک لگی ہو گی، وہ دودھ پینے کے لیے رو رہا ہو گا"۔

"وہ تو ٹھیک ہے ماں، لیکن آپ کو معلوم ہے کہ بھائی نے کسی آیا کا دودھ نہ پیا۔ وہ ابھی تک رو رہا ہے!"

"کیا؟ میرا لعل ابھی تک رو رہا ہے! کیا اتنے بڑے محل میں کوئی دودھ پلانے والی عورت موجود نہیں؟" یوکبد نے بے چینی سے پوچھا۔

"نہیں ماں، محل میں تو دودھ پلانے والی کئی عورتیں موجود تھیں، ان سب کو بلایا گیا، لیکن بھائی نے کسی کا دودھ نہیں پیا۔ سارے محل میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ملکہ نے جس بچے کو گود لیا ہے وہ کسی آیا کا دودھ نہیں پیتا۔ پھر میرے دل میں نہ جانے کیا بات آئی، میں نے ایک کنیز سے کہا کہ میں ایک ایسی عورت کو جانتی ہوں جو اس بچے کو دودھ پلانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ وہ کنیز اسی وقت ملکہ کے پاس پہنچی۔ ملکہ کا یہ سننا تھا کہ مجھے بلا بھیجا۔ میں نے ملکہ کو یقین دلایا کہ اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں ایک ایسی عورت کو یہاں لاؤں جس کا دودھ یہ بچہ ضرور پیے گا اور ماں میں سیدھی تمہارے پاس آ پہنچی ہوں ..... دیکھو اللہ نے اپنا وعدہ پورا کرنے کا کیسا شاندار انتظام کیا ہے!"

یوکبد سجدے میں گر گئیں۔ اللہ نے اس کے بھروسے کا مان رکھ لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بادشاہ کے محل میں تھیں۔ یوکبد نے دیکھا کہ اس کا پیارا بچہ بھوک سے رو رہا ہے اور وہ کسی کی گود میں خاموش نہیں ہو رہا۔ کنیزوں کا ایک جمگھٹا اس کے اردگرد کھڑا ہے لیکن اسے کسی کی آغوش میں وہ اپنائیت اور محبت نہیں مل رہی جو اسے چپ کرا دے۔ پھر یوکبد نے اسے ملکہ کی اجازت سے اپنی گود میں لیا، وہ خاموش ہو گیا اور دودھ پینے لگا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے اس ماں سے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ اس کی حفاظت کے لئے اسے دشمن کا محل فراہم کر دیا اور ماں کی ممتا کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے اس کا بچہ اس کی جھولی میں ڈال دیا۔

ماں کے اس بھروسے کا اللہ نے صرف یہی انعام نہیں دیا بلکہ یہ بچہ بڑا ہو کر اللہ کا مکرم رسول بنا۔ آج ساری دنیا انہیں حضرت موسیٰؑ کے نام سے جانتی ہے اور جس ظالم بادشاہ نے حضرت موسیٰؑ کی قوم یعنی بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرنے کا قانون بنایا تھا، اسے دنیا فرعون کے نام سے جانتی ہے اور جس رحم دل اور نیک ملکہ نے انہیں صندوق سے نکالا تھا۔ ان کا نام حضرت آسیہؓ تھا۔ جس بستی میں آپؑ پیدا ہوئے اس بستی کا نام جبش تھا اور یہ بھی ان ماں کے اللہ پر بھروسے ہی کی جزا تھی کہ جب فرعون جیسے ظالم بادشاہ نے حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ کرنے کی جرات کی تو اسے سمندر میں غرق کر دیا اور اس کی لاش کو رہتی دنیا تک کے لیے عبرت کا نمونہ بنا دیا۔

حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے اللہ پر بھروسا کرنے کی عظیم مثال قائم کی اور اللہ نے بھی ان کے بھروسے کا انعام دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اللہ کے اس عظیم پیغمبرؑ اور ان کی عظیم ماں پر لاکھوں رحمتیں نازل ہوں۔ آمین

ماں کی عظمت

ماں کی محبت بے لوث ہوتی ہے۔ وہ بچے کی خاطر راتوں کو جاگتی ہے۔ اسے لوریاں دے دے کر سلاتی ہے۔ اسے صاف ستھرا رکھتی ہے۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی ہے۔ اس کے اچھے مستقبل کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعائیں مانگتی ہے۔ وہ اپنے بچے کی خاطر جان دینے پر بھی تیار ہو جاتی ہے۔ اس پاک اور ایثار و قربانی کے جذبے میں اس کی ذاتی غرض کوئی نہیں ہوتی بلکہ اس میں خالصتاً اس کی پر خلوص محبت ہوتی ہے۔ احادیث میں ماں کی اس عظمت کو بجا طور پر سراہا گیا ہے۔

ایک شخص نبی کریمؐ کی خدمت میں آیا اور اس نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "تیری ماں" اس نے پوچھا: اس کے بعد کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "تیری ماں" اس نے پھر پوچھا: اس کے بعد کون؟ آپؐ نے فرمایا: "تیری ماں" اس نے چوتھی مرتبہ پھر دریافت کیا: اس کے بعد کون زیادہ حق دار ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "اس کے بعد تیرا باپ"۔

ماں کا درجہ اس قدر ہے کہ اگر ماں دین اسلام پر نہ ہو پھر بھی اس کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے۔ حدیث کی کتابوں میں ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی کریمؐ کے زمانہ میں میری والدہ آئیں جب کہ وہ مشرک تھیں تو میں نے آپؐ سے پوچھا: یا رسول اللہؐ! میری والدہ میرے پاس آئی ہیں اور انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا ہے، کیا میں ان کی مالی مدد اور ان کے ساتھ حسن سلوک کروں؟ رسول کریمؐ نے فرمایا: "ہاں ضرور! وہ تمہاری ماں ہیں ان کے ساتھ حسن سلوک کرو!"

"جو بچے ماں باپ کا ادب کرتے ہیں، ان کے ساتھ محبت سے پیش آتے ہیں، ان کی خدمت کرتے ہیں اور ان سے دعائیں لیتے ہیں ان سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔

حضرت فرید الدین عطار رحمتہ اللہ علیہ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ سرزمین خرقان میں ایک عظیم بزرگ حضرت ابوالحسن خرقانیؒ ہوئے ہیں۔ وہ اور ان کے بھائی بہت عبادت گزار تھے۔ انہوں نے آپس میں طے کیا کہ باری باری ایک بھائی رات کو عبادت کرے اور دوسرا بھائی پوری رات ماں کی خدمت گزاری کرے۔ ایک دن جب دوسرے بھائی کی باری ماں کی خدمت میں رہنے کی تھی، اس نے حضرت ابوالحسنؒ سے کہا "میرا دل چاہتا ہے کہ آج رات بھی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں اور آپ والدہ کی خدمت میں رہیں۔ چناں چہ آپ نے ان کو اجازت دے دی اور خود ماں کی خدمت میں رہے۔ اسی شب آپ کے بھائی نے جو عبادت میں مشغول تھے یہ غیبی آواز سنی کہ ہم نے تمہارے بھائی ابوالحسنؒ کی مغفرت کرنے کے ساتھ تمہیں بھی ان کے طفیل بخش دیا۔ یہ آواز سن کر انہیں حیرت ہوئی اور خدا سے عرض کیا کہ یا اللہ میں تیری عبادت کر رہا ہوں اور ابوالحسنؒ ماں کی خدمت میں ہے پھر میری مغفرت ان کے طفیل کیوں؟ غیب سے دوبارہ آواز آئی کہ تمہاری عبادت کی نسبت ابوالحسنؒ کا ماں کی خدمت میں رہنا ہمارے لیے زیادہ خوشنودی کا باعث ہے۔

پیارے بچو! جو لوگ ماں باپ کا ادب کرتے ہیں، ان کی دل و جان سے خدمت کرتے ہیں اور ان کے آرام کا خیال رکھتے ہیں وہ زندگی میں بھی کامیاب و کامران رہتے ہیں اور آخرت میں بھی۔

ضیغم حمیدی

ماں

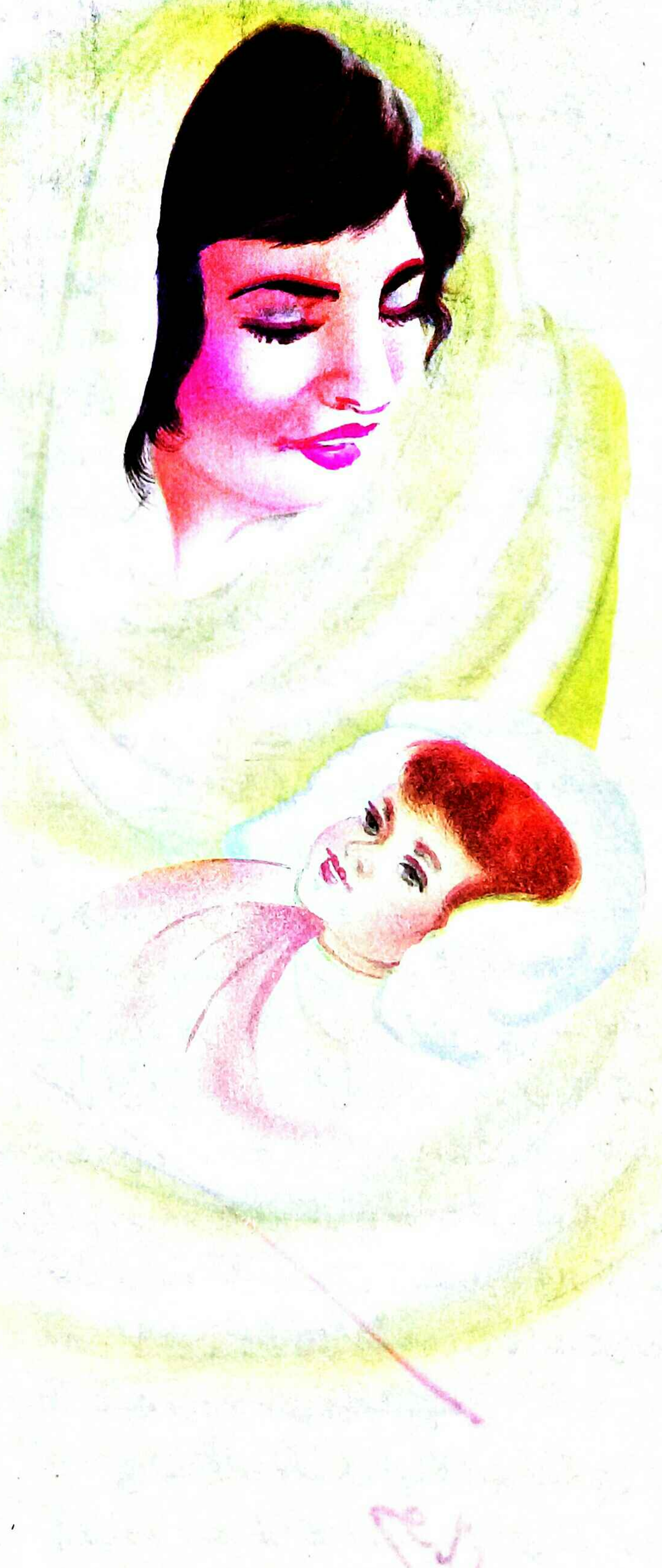

اے مری ماں! اے مری جنت! مری جان حیات
تو نہیں تو کچھ نہیں میرے لیے یہ کائنات
میں تری بے لوث چاہت کو بھلا سکتا نہیں
مول احسانات کا تیرے چکا سکتا نہیں
تو نے ہی تعلیم دی مجھ کو، مجھے پیدا کیا
کتنی تکلیفیں سہیں، میرے لیے کیا کیا کیا
تو مری محبوب، میری شاعری، میرا خیال
ہر زمانے میں تری قربانیاں ہیں بے مثال
کیسے لفظوں میں بیاں کوئی تری عظمت کرے
رب نے رکھی ہے مری جنت ترے قدموں تلے
تو مثالی باغباں ہے ننھی کلیوں کے لیے
رات بھر تو جاگتی ہے اپنے بچوں کے لیے
تو سراپا عظمت و ہمت ہے اور ایثار ہے
کس قدر اعلیٰ و لاثانی ترا کردار ہے
دلنواز و دلکش و دلدار و دلبر دل نشیں
تجھ سے بڑھ کر اس جہاں میں اور کوئی شے نہیں

دو مائیں دو بیٹے

سید نظر زیدی

آدمی چاہے بوڑھا ہو جائے بچپن کی باتیں نہیں بھولتا۔ اکثر نہ ہی سہی، لیکن کبھی نہ کبھی یہ باتیں اس طرح یاد آجاتی ہیں جیسے ان کا تعلق کچھ ہی دن پہلے سے ہو۔ بات اصل میں یہ ہے کہ بچپن انسان کی زندگی کا سب سے زیادہ خوب صورت حصہ ہوتا ہے۔ ساری دنیا اپنی لگتی ہے۔ یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی کہ جس چیز کی فرمائش کر رہے ہیں اسے خریدنے کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ کوئی کھلونا پسند آگیا یا کھانے کی کسی چیز کو دل چاہا تو بے سوچے سمجھے مچل گئے۔ امی جان ہم قورمہ لیں گے یا یہ کھائیں گے۔ اب امی جان لاکھ سمجھائیں کہ یہ چیز اس وقت نہیں خریدی جا سکتی، لیکن ننھے میاں ہیں کہ برابر ضد کئے جارہے ہیں۔ نہیں امی جان، ہم تو اسی وقت لیں گے۔ اور اکثر یہ ضد پوری کردی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں، پریشانیاں اٹھا کر بھی ان کی ضدیں پوری کرتے ہیں۔

اوروں کی طرح یہ باتیں کبھی کبھی مجھے بھی یاد آتی ہیں اور کچھ دیر کے لیے میں ان میں کھو جاتا ہوں۔ یہ یادیں کبھی کھیل کے میدان میں پہنچا دیتی ہیں، کبھی کلاس روم میں اور کبھی امی ابو اور بہن بھائیوں کے درمیان۔ یہاں تک کہ اس زمانے کے ساتھیوں سے ہونے والے لڑائی جھگڑے تک یاد آجاتے ہیں اور بڑا مزہ دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں اگرچہ یہ بات کسی لحاظ سے بھی مناسب نہیں، لیکن چوں کہ سچی ہے اس لیے بتا رہا ہوں کہ آج سے پہلے جب کبھی مجھے اپنی امی یاد آتی تھیں تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ آخر وہ ایسی سخت دل کیوں تھیں؟ میرے ساتھ ان کا سلوک اسکول کے استادوں سے بھی کچھ زیادہ سخت تھا۔ معمولی سے معمولی غلطی بھی معاف نہ کرتی تھیں۔ منہ اندھیرے اٹھنے اور وضو کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیتیں۔ موسم سردی کا ہو یا گرمی کا نہانا لازمی تھا، کوئی چیز اچھی لگتی یا نہ لگتی حکم تھا اپنے حصے کا پورا ناشتہ ختم کرو۔ ایک دو پروگراموں کے سوا ٹیلی وژن دیکھنے پر پابندی تھی۔ سورج ڈوبنے کے بعد گھر سے نہ نکلنے دیتی تھیں۔ نو بجتے ہی بستر میں گھس جانا لازمی تھا۔ غرض ہم بے چارے بچوں پر مارشل لا لگا رکھا تھا انھوں نے۔ بار بار دل چاہتا تھا بغاوت کردیں ان کے خلاف۔ ایک بھی حکم نہ مانیں ان کا۔ لیکن ان کا رعب ایسا تھا کہ چوں نہ کر سکتے تھے۔ بہت بڑی مصیبت یہ تھی کہ ان کے فیصلے کے خلاف اپیل بھی نہ ہو سکتی تھی۔ دادی اماں سے شکایت کرتے یا ابا جان سے، تاکید کی جاتی "بیٹے، اپنی امی کا کہنا مانو"۔ اور ان امی جان کا حال یہ تھا کہ اچھی بھلی زندگی کو حکم احکام کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا تھا۔

خاص طور پر مجھے ان کی طرف سے لگائی گئی پابندیاں اس لیے بھی بری لگتی تھیں کہ اسی گھر میں خالہ جان اور ان کا بیٹا

حبیب بھی رہ رہے تھے اور یہ حبیب الرحمان صاحب ایسی شان دار زندگی گزار رہے تھے کہ ان پر کوئی پابندی ہی نہ تھی۔ نہ نماز پڑھنے کی، نہ نہانے اور اپنے کپڑوں کو صاف ستھرا رکھنے کی۔ جب تک دل چاہتا تھا ٹیلی وژن دیکھتے تھے اور جتنی دیر چاہتے تھے گھر سے باہر رہتے تھے۔

ہماری ان خالہ صاحبہ کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور کوئی اور قریبی رشتہ دار نہ ہونے کی وجہ سے امی جان نے انہیں اپنے پاس بلالیا تھا۔ وہ ہمارے گھر کے ایک حصے میں رہتی تھیں جو الگ تو تھا، لیکن اس طرح کہ ہم ان کے کمرے میں اور وہ ہمارے کمروں میں آجا سکتی تھیں۔ اسی آسانی کی وجہ سے ہمیں ان کے بیٹے حبیب کی آزادی کا سارا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ ہم سوچا کرتے تھے کاش ہماری امی بھی ہمارے اس بھائی کی امی جیسی بن جائیں۔

اپنی امی جان کے بارے میں میری یہ دکھ دینے والی یادیں آج سے پہلے اسی طرح کی تھیں۔ وہ جب بھی یاد آتی تھیں ڈانٹتی ڈپٹتی اور حکم چلاتی دکھائی دیتی تھیں۔ مجھے وہ واقعہ بھی اکثر یاد آتا تھا جب خالہ جان ہمارا گھر چھوڑ کر کراچی اپنے خاوند کے ایک دور کے رشتے دار کے پاس چلی گئی تھیں اور ہماری امی جان سے خوب لڑی تھیں۔

بڑی عید، آنے میں دس پندرہ دن رہ گئے تھے۔ ہمارے ابا جان ہمیشہ کی طرح قربانی کے لیے دو بکرے خرید کر لاتے تھے اور بہت ہی خاص مہربانی کر کے امی جان نے ہمیں یہ اجازت دے دی تھی کہ دونوں بکروں کو تھوڑی دیر کے لیے کھیتوں کی طرف لے جایا کریں جو ہمارے گھر سے تھوڑے سے فاصلے پر تھے۔ ہم نے بھائی حبیب سے کہا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ چلا کریں۔ لیکن وہ ہمارے ساتھ نہ جاتے تھے بلکہ ضد کرتے رہتے کہ ان کی امی بھی قربانی کے لیے بکرا خرید لیں۔ ان کی امی یہ بات نہ مانتی تھیں اور اس وجہ سے ماں بیٹا جھگڑتے رہتے تھے۔

دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ جیسے جیسے عید قریب آرہی تھی ہماری خوشیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہماری باجی نے دونوں بکروں کی پیشانیوں اور کمر پر مہندی لگا کر بہت خوشنما پھول بنائے تھے جس سے وہ اور بھی اچھے لگتے تھے۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ حبیب بھائی نہ جانے کہاں سے ایک ٹیڈی بکرا پکڑ لائے۔ ان کی امی نے پوچھا کہ یہ بکرا کہاں سے لائے ہو تو حبیب نے آئیں بائیں شائیں کر کے انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔ ان کی باتیں سن کر وہ تو خیر خاموش ہو گئیں، لیکن میری امی نے بہت سختی سے کہا "بہن، حبیب سے کہو یہ بکرا جہاں سے لایا ہے وہیں چھوڑ کر آئے۔ اگر خدا نہ کرے بکرے کے مالک نے پولیس میں رپٹ لکھوا دی تو چوری کا مقدمہ بن جائے گا اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے"۔

ہماری امی کی یہ بات بالکل ٹھیک تھی، لیکن حبیب بھائی اڑ گئے کہ میں بکرا اپنے پاس ہی رکھوں گا اور عید کے دن اس کی قربانی دوں گا۔ ان کی امی بھی ان کی حمایت کرنے لگیں۔ اس

بات پر دونوں بہنوں میں اچھی خاصی لڑائی ہو گئی اور خالہ جان ٹیڈی بکرے اور بیٹے کو لے کر کراچی چلی گئیں۔ ہم لوگوں کو کچھ دن تو یہ بات یاد رہی لیکن پھر بھول بھال گئے۔ دن ایک ایک کر کے گزرتے گئے۔ میں نے اور میرے بھائیوں اور بہنوں نے تعلیم مکمل کی، ہماری شادیاں ہوئیں اور اپنے اپنے طور پر آرام اور عزت سے زندگی گزارنے لگے۔

میں نے ایم اے پاس کر کے مقابلے کا امتحان پاس کیا تھا اور اللہ کی خاص مہربانی سے سیشن جج کے اونچے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ میری یہ زندگی پہلی زندگی سے بہت مختلف تھی۔ اللہ کے قانون کے مطابق امی اور ابا جان دونوں جنت سدھار گئے تھے۔ اب میں اپنے خاندان کے فیصلے کیا کرتا تھا۔ جس طرح میرے ماں باپ ہمارے فیصلے کیا کرتے تھے۔ ہمارے اپنے معاملات تھے اور اپنی باتیں، بھولے بھٹکے کبھی پرانے زمانے کی باتیں بھی یاد آجاتی تھیں اور جیسا کہ میں نے بتایا ان یادوں میں امی جان ایک سخت گیر ماں کی حیثیت ہی سے یاد آتی تھیں اور سچی بات ہے میں اس پر افسوس بھی کرتا تھا کہ وہ اتنی سخت کیوں تھیں!

آج سے پہلے یہ معاملہ بالکل یونہی تھا لیکن آج ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں نے اپنی امی کو ایک مہربان ماں نہ سمجھنے کے گناہ کی اللہ سے معافی مانگی اور اپنے آپ کو بہت ملامت کی کہ میں نے اپنی پیاری امی جان کے بارے میں ایسا غلط خیال کیوں دل میں بٹھائے رکھا تھا۔

آج میری عدالت میں سب سے پہلے حبیب الرحمان ولد نجیب الرحمان نام کے ملزم کا مقدمہ پیش کیا گیا۔ یہ نام سن کر میں چونکا۔ کیوں کہ یہ میرے اس خالہ زاد بھائی کا تھا جو کافی عرصہ پہلے اپنی امی کے ساتھ ہمارے گھر آیا تھا۔ ایک نام کے کئی آدمی ہوتے ہیں، لیکن اس ملزم کے باپ کا نام بھی وہی تھا جو میرے خالہ زاد بھائی کے باپ، یعنی میرے خالو مرحوم کا تھا۔ ملزم کٹہرے میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ پتلے دبلے جسم کا ایک کم زور سا آدمی تھا۔ میں نے غور سے دیکھا اور دل میں پیدا ہونے والے اس خیال کو جھٹلانے کی کوشش کی کہ یہ میرا خالہ زاد بھائی ہے۔ لیکن اس کے ماتھے پر لگے ہوئے زخم کے نشان نے صاف گواہی دی کہ یہ وہی حبیب الرحمان ہے اور میں نے شرمندہ سا ہو کر سر جھکا لیا۔ میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ میری سگی خالہ کے لاڈلے بیٹے کو ہتھکڑیاں پہنا کر میری عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ میرا دل چاہا کہ حکم دوں اس کی ہتھکڑیاں فوراً کھول دو اور عزت سے کرسی پر بٹھاؤ، لیکن میں قانون کے سامنے بے بس تھا۔ اس بات پر غور کیے بغیر کہ ملزم میرا رشتہ دار ہے یا غیر، میرا کام انصاف کے ساتھ اس کے مقدمے کا فیصلہ کرنا تھا۔

پولیس نے ملزم حبیب الرحمان کو چوریاں کرنے اور ڈاکے ڈالنے کے الزام میں گرفتار کیا تھا اور یہ کیس کچھ اس طرح تیار کیا تھا کہ اسے کم سے کم سات برس قید سخت کی سزا ہو جاتی تھی۔ پولیس کا کہنا تھا کہ ملزم ایک عادی مجرم ہے۔ چوری اور ڈاکہ ڈالنے کے جرم میں کئی بار سزا پا چکا ہے۔ اس مقدمے میں اس کے پاس سے لوٹا ہوا مال بھی برآمد ہوا ہے اور وہ گواہ بھی موجود ہیں جنھوں نے اسے جرم کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

خدا کے خاص فضل سے میں ہر مقدمے کا فیصلہ انصاف کے مطابق کرتا ہوں۔ لیکن آج میں نے اپنے دل و دماغ کی حالت کچھ بدلی ہوئی محسوس کی۔ لگا کہ کوئی طاقت مجھے مجبور کر رہی ہے کہ جس طرح بھی ہو اس ملزم کو آزاد کر دوں، تاہم میں نے بہت کوشش کی اور اپنی حالت پر قابو پا لیا، پکا ارادہ کیا کہ چاہے یہ ملزم میرا رشتہ دار ہی ہے، لیکن میں اس کے مقدمے کا فیصلہ بھی انصاف کے مطابق کروں گا۔

قاعدے کے مطابق مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ ملزم پر جو الزام لگائے گئے تھے وہ پڑھ کر سنائے گئے۔ گواہوں نے گواہیاں دیں اور پولیس نے وہ سامان پیش کیا جو لوٹا گیا تھا۔ یہ سارا معاملہ ایک طرح صاف شفاف تھا۔ ملزم مجرم ثابت ہوا تھا۔ اس کے خلاف سب سے بڑی گواہی اس کی پچھلی زندگی تھی جس میں وہ کئی بار ایسے ہی جرم کر کے جیل جا چکا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل نہ مان رہا تھا کہ اس نے یہ جرم کیا ہے جس کی بنیاد پر اسے میری عدالت لایا گیا ہے۔ چناں چہ میں نے اپنے اس یقین کی بنا پر پولیس کے انسپکٹر سے پوچھا "کیا یہ بات درست ہے کہ اس شخص نے دن کے وقت بھرے بازار میں دکان پر ڈاکہ

ڈالا' کئی آدمیوں کو زخمی کیا اور تم نے اس کا پیچھا کر کے بڑی مشکل سے اسے گرفتار کیا؟"

"مائی لارڈ' یہ سب باتیں بالکل ٹھیک ہیں۔ گواہوں نے ان سب کو ٹھیک بتایا ہے" انسپکٹر نے جواب دیا۔

"ٹھیک' لیکن انسپکٹر صاحب اس ملزم کی جسمانی حالت سے تو یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ بہادری کا ایسا کام کر سکتا ہے۔ یہ تو ایسا کمزور ہے کہ آسانی سے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ڈاکہ ڈالنے' کئی آدمیوں کو زخمی کرنے اور پھر وہاں سے بھاگنے کا کام کوئی طاقت ور آدمی ہی کر سکتا ہے؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"سرکار والا' یہ عادی مجرم بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ اس کے دبلا پتلا ہونے پر نہ جائیے۔ یہ بہت نڈر اور پھرتیلا ہے" انسپکٹر نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

انسپکٹر کی یہ بات سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ جس آدمی کو وہ بہت طاقت ور اور پھرتیلا بتا رہا تھا وہ اس قدر کمزور تھا کہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ اس کے گال پچکے ہوئے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ایک بیوقوف بھی کہہ سکتا تھا کہ یہ آدمی بھرے بازار میں ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔ مجھے گواہوں پر بھی شک ہوا۔ ان میں ایک ایسا تھا جسے میں نے کئی بار کچہری میں دیکھا تھا۔ ایسے گواہوں کو پولیس کا ٹاؤٹ کہا جاتا ہے۔ وہ کچھ رقم لے کر جھوٹی گواہی دینے پر تیار ہو جاتے ہیں اور ان سے مدد لے کر بعض پولیس والے بے گناہوں کو سزا دلوا دیتے ہیں۔ میں نے اس گواہ سے پوچھا "تم خدا کو حاضر ناظر جان کر ایک بار پھر کہو کہ تم نے اس شخص کو جس کا نام حبیب الرحمان ولد نجیب الرحمان ہے ڈاکہ ڈالتے' لوگوں کو زخمی کرتے اور فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا!"

وہ جلدی سے بولا "مائی لارڈ" میں حلف اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اسے ڈاکہ ڈالتے' لوگوں کو زخمی کرتے اور وہاں سے فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ مائی لارڈ' بہت خطرناک ڈاکو ہے یہ"۔

"ٹھیک' اچھا یہ بتاؤ کیا تم نے کسی اور مقدمے میں بھی گواہی دی ہے؟ ہمارا مطلب ہے تم پیشہ ور گواہ تو نہیں ہو جو اپنی فیس لے کر گواہی دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں!"

میرا یہ سوال سن کر وہ گھبرا گیا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی گھبراہٹ اس بات کا ثبوت تھی کہ اس نے جھوٹی گواہی دی ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ پولیس والے ایک بے گناہ شخص کو پکڑ لائے ہیں اور اپنے نمبر بنانے کے لیے سزا دلوا رہے ہیں۔ میں نے دیکھا ملزم بہت حیران ہو کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔

بالکل ٹھیک انصاف کرنے کے خیال سے میں نے پورے معاملے پر ایک بار اور غور کیا۔ مقدمے کے خاص کاغذات دوبارہ پڑھے اور اس کے بعد پیش کار سے کہا "شیخ صاحب' اس ملزم کا مقدمہ کچھ ایسا ہے کہ شاید ہم پورا پورا انصاف نہ کر سکیں گے۔ آپ یوں کیجئے کہ اس کا کیس کسی اور عدالت میں بھیج دیجئے اور سرکار کی طرف سے اس کے لیے ایک اچھے سے وکیل کا انتظام بھی کر دیجئے۔ لگتا ہے یہ اپنی صفائی پیش کرنے کے قابل نہیں ہے"۔

یہ حکم دے کر میں نے طبیعت ٹھیک نہ ہونے کا کہ کر عدالت برخاست کر دی اور گھر آ گیا۔ پولیس والوں کی ایسی بے اصولی دیکھ کر میری طبیعت واقعی خراب ہو گئی تھی۔ میرا دل رنج سے بھر گیا تھا۔

میری توقع کے مطابق دوسرے جج صاحب نے پہلی پیشی پر ہی ملزم کو باعزت بری کر دیا۔ ساتھ ہی بے ایمانی کرنے والے پولیس والوں کے خلاف مقدمہ چلانے کا حکم بھی دیا۔ میں نے یہ انتظام کر دیا تھا کہ میرے بھائی حبیب الرحمان کو رہائی ملے تو اسے میرے گھر پہنچا دیا جائے اور اب وہ ایک معزز مہمان کی حیثیت سے میرے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ نہلا دھلا کر اسے صاف ستھرا لباس پہنا دیا گیا تھا۔ رہنے کے لیے صاف ستھرا کمرا دیا گیا تھا اور آرام پہنچانے کا سارا انتظام کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس سارے انتظام کے باوجود وہ بجھا بجھا اور شرمندہ شرمندہ تھا۔ اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جس جج نے اس کی مدد کی اور سزا سے بچایا ہے

وہ اس کی خالہ کا وہی بیٹا ہے جس کے ساتھ لڑکپن میں کچھ دن گزارے تھے۔

میں اس سے ملنے کے لیے اس کے کمرے میں گیا تو وہ اداس بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور آنسو روکتے ہوئے بولا "اکرم بھائی' مدتوں بعد آپ سے ملاقات بھی ہوئی تو کس حالت میں۔ کاش میں آپ سے نہ ملتا اور مجھے جیل بھیج دیا جاتا۔ کس قدر سبکی ہوئی ہے آپ کی۔ اس بات سے کہ مجھ جیسا ذلیل مجرم آپ کا رشتے دار ہے"۔ بات ختم کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"ویسے یقین کیجئے اس معاملے میں میں بالکل بے گناہ ہوں۔ انسپکٹر نے اصل ڈاکو کی جگہ مجھے آپ کی عدالت میں پیش کر دیا گیا ہے"۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگالیا اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ دل بھاری نہ کریں۔ حبیب بھائی زندگی کے معاملے کچھ ایسے ہی ہیں۔ یہ سب تقدیر کے فیصلے ہیں کہ آپ اس حالت کو پہنچے۔ بہرحال اب پچھلی باتوں کو بھول جائیے"۔

"نہیں اکرم بھائی' نہیں یہ تقدیر کا فیصلہ نہیں بلکہ میرے گناہوں کی سزا ہے۔ کاش میں نے بھی آپ کی طرح تعلیم حاصل کی ہوتی اور اپنی عادتوں کو اچھا رکھا ہوتا" وہ روتے ہوئے بولا۔

"ہاں یہ تو ہے۔ عادتوں کو اچھا رکھے اور خوب محنت سے تعلیم حاصل کئے بغیر انسان عزت کا مقام حاصل نہیں کر سکتا' لیکن میں سمجھتا ہوں اس میں آپ کا مقدر نہیں ہے۔ اگر کسی نے غلطی کی ہے تو وہ خالہ جان ہیں۔ تمہیں جن کے لاڈ پیار نے اچھے ماحول میں بھی رہنے نہ دیا اور تعلیم سے بھی دور رکھا۔ کاش وہ ہمارے گھر سے نہ جاتیں"۔ میں نے افسوس بھری آواز میں کہا۔ مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جب وہ ناراض ہو کر ہمارے گھر سے چلی گئی تھیں۔

وہ جلدی سے بولا "بالکل نہیں اکرم بھائی' بالکل نہیں۔ امی جان کا کوئی قصور نہیں بلکہ اس معاملے میں ساری غلطی میری ہے۔ بے شک وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی محبت کرتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں مجھے ذرا سی تکلیف بھی نہ پہنچے۔ لیکن یہ ان کی مجبوری تھی۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس سلسلے میں اگر غلطی ہے تو میری ہے۔ میں بہت ضدی اور خود سر تھا۔ نہ اپنی امی جان کا کہنا مانتا تھا نہ کسی اور کا اور میری بری عادتوں کا وہی نتیجہ نکلنا چاہیے تھا جو نکلا۔ ماں کو تو اللہ پاک دل ہی ایسا دیتا ہے کہ وہ اپنے بچوں پر جان چھڑکتی ہے۔ چاہتی ہے کہ اس کے بچوں کو گرم ہوا بھی نہ لگے۔ یہ تو خود بچوں کا کام ہے کہ وہ اپنی ماں کا کہنا مانیں' شوق سے تعلیم حاصل کریں اور اپنی عادتوں کو اچھا رکھیں۔ کاش میں بھی آپ جیسا ہوتا' کاش"۔ اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہ نکلے اور وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا' لیکن اب میرا خیال اس کے بجائے اپنی پیاری امی جان کی طرف پھر گیا تھا جو معمولی معمولی باتوں پر ہمیں ٹوکتی تھیں اور اپنے فیصلے منواتی تھیں۔ میں دل ہی دل میں ان کے لیے دعائیں کر رہا تھا اور اس بات کے لیے اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ میں اپنی پیاری امی جان کا حکم مانتا تھا۔ میں پوری طرح محسوس کر رہا تھا کہ آج میں جس عزت کے مقام پر ہوں صرف اپنی پیاری امی جان کی وجہ سے ہوں۔ میرا سر جھکا ہوا تھا اور میری آنکھوں سے بھی آنسو بہ رہے تھے۔ لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ ہم دونوں کچھ دیر خاموش رہے پھر میں نے حبیب بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ کو یاد ہو گا جب آپ اور آپ کی امی ہمارے گھر سے گئے تھے تو بڑی عید قریب تھی۔ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ اب ملاقات ہوئی تو عید آنے میں چند دن ہی رہ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میں نے آپ کی اور خالہ جان کی طرف سے بھی قربانی دینے کے دو بکرے خریدے ہیں۔ یہ دونوں بکرے آپ اپنے ہاتھ سے ذبح کیجئے گا"۔

میں نے تو یہ بات حبیب بھائی کو خوش کرنے کے لیے کہی تھی لیکن وہ کچھ اور اداس ہو گئے۔ شاید انہیں وہ ٹیڈی بکرا یاد آگیا تھا جو وہ نہ جانے کہاں سے پکڑ لائے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ آدمی سے کوئی غلطی ہو جائے تو ساری زندگی پریشان کرتی ہے۔ فائدے میں وہ رہتے ہیں جو غلطی کرتے ہی نہیں۔ کاش حبیب بھائی ایسے ہی ہوتے!!

☆ ☆ ☆

وہ کتنی بدتمیز ہے' آدھی چھٹی میں تو ایسے گھل مل کر کھیل رہی تھی اور اب....! مینا کو واقعی بہت دکھ ہوا۔ مینا تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ اس کے ابو ایک مقامی کالج میں حساب پڑھاتے تھے جبکہ اس کی امی ایک گھریلو خاتون تھیں۔ مینا اور دانش دو ہی بہن بھائی تھے۔ مینا تو خیر اسکول جاتی تھی لیکن اس کا ننھا بھائی ابھی صرف چھ ماہ ہی کا تھا۔ مینا یوں تو خاصی ذہین اور خوش مزاج بچی تھی لیکن اس کی طبیعت میں کچھ عجیب سی لاپرواہی تھی۔ وہ کوئی بھی کام جم کر اور پوری توجہ سے نہیں کر سکتی تھی۔ صبح ناشتے کی میز پر انڈے کی زردی دیکھ کر اسے نہ جانے کیوں اپنے رنگین چاک نظر آ جاتے اور ناشتہ وہیں چھوڑ کر رنگین چاکوں کے ڈبے کو کسی نئے انداز سے ترتیب دینے لگتی۔ اسکول میں حساب کے سوال حل کرتے ہوئے اسے اس موٹی بلی کی یاد ستانے لگتی جسے اس نے صبح پڑوسیوں کی دیوار پر بیٹھے دیکھا ہوتا اور شام کو دودھ کا گلاس سامنے رکھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی سہیلی ندا کے موٹے تازے ابو کی توند گھومنے لگتی۔ اپنی اس لاپروا طبیعت کی وجہ سے وہ اکثر اسکول میں بھی اپنی استانی سے ڈانٹ کھاتی۔ مینا کی امی جانتی تھی کہ ان کی بیٹی دراصل بہت ذہین ہے لیکن وہ خود بھی اس کے غیر ذمہ دارانہ مزاج سے نالاں تھیں۔ امی کے مطابق مینا اگر اپنی پوری توجہ صرف کام پر رکھتی تو ہر کام بہتر طور پر کر سکتی تھی۔ لیکن شرط صرف یہ تھی کہ وہ کوئی بھی کام کرتے وقت اپنا دھیان بٹنے نہ دے۔ اسکول سے واپسی پر جب مینو گھر پہنچی تو امی نے دیکھا کہ مینا نے ایک چٹیا کھولی ہوئی ہے اور سویٹر اس نے کمر کے گرد لپیٹا ہوا ہے۔ "مینو' کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو؟" امی نے اس کا اوٹ پٹانگ حلیہ دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔

"نہیں تو امی' بس آخری پریڈ میں نیند آ رہی تھی" مینا نے گردن ٹیڑھی کر کے جواب دیا۔

"کیا بات ہے مینا مجھے بتاؤ" امی نے مینا کا بازو پکڑ کر اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"امی وہ....." مینا کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ پھر اس نے بہت دکھے دل کے ساتھ آج کلاس میں ہونے والا تمام واقعہ امی کو سنایا۔

"ارے بیٹے' راحیلہ تو مذاق کر رہی ہو گی اور جب کوئی مذاق کرے تو اس کے جواب میں ہنستے ہیں۔ تمہیں تو خود معلوم ہے کہ تم سبق یاد کر کے جاتی ہو۔ ویسے بھی تمہارا مضمون تو مس اور میڈم نے دیکھنا ہے راحیلہ یا ندا نے تو نہیں" اس کی بات سن کر امی اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔ "بھئی تم مضمون لکھ کر مقابلے میں ضرور حصہ لو۔ تم تو بہت اچھا مضمون لکھ لیتی ہو" امی نے اس کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا چلو' اب جاؤ یونی فارم تبدیل کر لو۔ ابھی تمہارے ابو جان بھی آجائیں گے۔ میں کھانا لگاتی ہوں" امی نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

جب مینا کھانے کی میز پر آئی تو ابو جان بھی گھر آ چکے تھے۔ مینا کا موڈ اب کافی بہتر ہو چکا تھا۔ امی نے ابو کو مضمون نویسی کے مقابلے کے متعلق بتایا تو وہ بھی کہنے لگے "بھئی مینا' مضمون تو تمہیں ضرور لکھنا پڑے گا"۔

"مگر ابو' مضمون میں میں کیا لکھوں؟" اس نے پوچھا۔

"سب سے پہلے تو بتاؤ کہ بہترین دوست ہوتا کون ہے؟" ابو پانی کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے بولے۔

"بہترین دوست وہ ہوتا ہے جس کے ہم بھی بہترین دوست ہوں" مینا نے فلسفہ بگھارتے ہوئے کہا۔

"کچھ اور؟" ابو مینا کی بات پر مسکرائے اور کہا۔

"جو ہمیں بہت اچھا لگتا ہو" مینا نے بتایا۔

"ہاں اور سب سے اچھا ہمیں وہی انسان لگتا ہے جو ہو ہی بہت اچھا۔ دیکھو بہترین دوست وہ ہوتا ہے جو مشکل میں ہمارے کام آئے اور ہمیں خوش دیکھ کر خوش ہو" ابو نے سمجھایا۔

"ابو! مصیبت میں کام آئے؟ جیسے چوٹ لگ جائے تو

کا نام وہ پکارتیں وہ اپنی جگہ پر کھڑی ہو جاتی۔ یہاں تک کہ پوری کلاس میں صرف مینا ہی بیٹھی رہ گئی۔ پھر مس نے سب بچیوں کے مضمون باری باری پڑھ کر سنائے اور باقی بچیوں کے مشورے سے کچھ مضامین کو چن کر الگ کر لیا۔ مضامین پڑھنے کے بعد مس رابعہ کو اندازہ ہوا تھا کہ بہت سی بچیوں نے مضمون کے مواد سے زیادہ اس کی سجاوٹ پر زور دیا تھا۔ ''مینا! کیا تم اپنا مضمون کل لے کر آؤ گی؟'' آخر میں مس نے مینو سے پوچھا۔

''جی مس، کل یا پھر....'' مینا نے کھڑے ہو کر کچھ شرمندگی سے کہا۔

مینا کے اس انداز پر اکثر بچیاں ہنسنے لگیں تو مس نے انہیں سختی سے ڈپٹ دیا۔ ''ٹھیک ہے مینو، مضمون جمع کروانے کا وقت تو ہفتے کی صبح تک ہے، کل یا پرسوں تم جب مضمون مکمل کر لو تو لے آنا'' مس رابعہ نے مسکرا کر کہا۔

جمعرات کی شام کے بعد جمعے کا دن اور پھر جمعے کی شام بھی گزر گئی لیکن مینا مضمون نہ لکھ پائی۔ اب تو وہ خود سے بہت ہی مایوس ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے نہ ہی اس نے مضمون لکھا تھا اور اب نہ ہی وہ مقابلے میں شریک ہو سکے گی۔ اس پر افتاد یہ کہ امی بھی آج صبح دائی کو لے کر نانی جان کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ بے چاری نانی جان کا گھٹنا غسل خانے میں پھسل جانے کی وجہ سے زخمی جو ہو گیا تھا۔ مینا نے رات کا کھانا زہر مار کیا اور منہ بسورتی بستر میں لیٹ گئی۔ ابو حسب معمول اپنی کتاب میں گم تھے۔ اگر امی گھر میں ہوتیں تو یقیناً اس کی دل جوئی کرتیں اور حوصلہ بڑھاتیں۔ اسے امی بہت زیادہ یاد آنے لگیں اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کیا بات ہے مینو بیٹے؟'' ابو کتاب چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ابو جان، وہ میں امی کو فون کر لوں'' مینا نے پوچھا۔

ابو نے پہلے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر بولے ''ہاں ہاں کر لو ابھی تو وہ جاگ رہی ہوں گی۔ مینا چھلانگ لگا کر بستر سے نکلی تو ابو مسکرا پڑے۔ وہ جانتے تھے کہ مینو اپنی امی کے بغیر اداس ہو گئی ہے۔ دوسری ہی گھنٹی پر امی نے فون اٹھا لیا۔ اس نے امی کی آواز پہچان کر سلام کیا تو امی نے سلام کا جواب دینے کے بعد اس کی خیریت دریافت کی۔

''ٹھیک ہوں۔ امی، نانی جان کا کیا حال ہے'' مینو اداسی سے بولی۔

''نانی جان تو اب ٹھیک ہیں مگر تم سناؤ، اس قدر اداس کیوں ہو گئی ہو؟'' امی نے اس کے لہجے کی اداسی کو محسوس کرتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

''امی آپ کب آئیں گی؟'' مینا نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''ارے مینا یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، میں ان شاء اللہ کل تمہارے اسکول سے واپس آنے سے پہلے ہی آجاؤں گی۔ اور بیٹے آپ کے ابو جان بھی تو ہیں آپ کے پاس'' امی نے سمجھایا۔

''امی میں نہیں جاؤں گی کل اسکول، میرا مضمون نہیں لکھا گیا'' مینا نے تقریباً روتے ہوئے انہیں اصل بات بتا دی۔ ''وہ کیوں؟'' امی نے تشویش سے پوچھا۔

''امی مضمون تو بہت اچھا لکھنا ہے اور جو بات میں سوچتی ہوں وہ اتنی اچھی نہیں ہوتی جیسا مضمون لکھنا ہے'' مینا نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ اس کی بات سن کر امی ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولیں ''دیکھ مینا، اگر تمہیں یہ معلوم ہے کہ اچھا مضمون کیسا ہوتا ہے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ تم بہت اچھی باتیں لکھ سکتی ہو۔ دیکھو مینو ابھی صرف نو بجے ہیں۔ تم چلو شاباش! اب پہلے 5 منٹ سوچو، اور جو کچھ تمہارے ذہن میں آتا ہے کاپی میں لکھ ڈالو۔ ہاں! مگر شرط یہ ہے کہ تم اپنی ساری توجہ اپنے کام پر ہی رکھو، پھر دیکھنا تم کتنا اچھا مضمون لکھ لو گی۔ شاباش! فوراً سوچنا شروع کر دو، تم میری بہت پیاری بیٹی ہو'' امی نے بہت محبت اور جوش سے اس کی ہمت بندھائی۔ مینا فون بند کر کے آئی تو واقعی بہت مطمئن تھی۔ اس نے صوفے پر بیٹھ کر سوچنا شروع کیا اور ابھی 10 منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ اس کے

ہماری مدد کرے؟" مینا نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں! یوں بھی لیکن مشکل میں کام آنا تو یہ بھی ہے کہ وہ ہمیں غلط کام کرنے سے روکے اور اچھے کام کرنے میں حوصلہ افزائی کرے اور سب سے ضروری بات بہترین دوست وہ ہے جس سے آپ اپنے دل کی بات کہہ سکیں۔ جس پر آپ اعتماد کریں اور جو آپ پر اعتماد کرے۔ کیوں' ٹھیک ہے نا؟" ابو نے تفصیل سے وضاحت کی' مگر مینا تو ایک بار پھر کھانا بھول کر سوچ کی وادی میں گم ہو چکی تھی۔ پھر یک دم چونک کر بولی "تو ابو جان! جیسا آپ نے بتایا ہے ہمارا کوئی ایسا دوست ہو تو اس پر مضمون لکھنا ہے؟"

"نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی لکھنا ہے کہ وہ آپ کا دوست کیوں ہے" ابو نے بالکل اسی انداز میں کہا جیسے وہ کالج میں پڑھاتے تھے۔

شام کو جب مینا نے اسکول کا کام کر لیا تو مضمون لکھنے کی تیاری کرنے لگی۔ بہت دیر کاپی پنسل ہاتھ میں پکڑے وہ سوچتی رہی کہ کیا لکھے لیکن اس کے ذہن میں کچھ بھی تو نہ آرہا تھا۔ آخرکار وہ دوبارہ امی کے سر پر آن موجود ہوئی۔

"امی مجھ سے تو نہیں لکھا جا رہا۔ آپ لکھ دیں مجھے مضمون" وہ بہت لاڈ سے مخاطب ہوئی۔

"کیا؟ مینا' یہ تو بالکل غلط بات ہے۔ اگر یہ مضمون تمہیں میں لکھ دوں تو یہ تو سراسر بے ایمانی ہو گی" امی نے کہا۔

"امی' میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا" مینا نے بے چارگی سے کہا۔

"سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے؟" امی نے کچھ سختی سے پوچھا "دیکھو ابو نے تمہیں بتایا ہے کہ بہترین دوست کون ہوتا ہے۔ اب تم یہ سوچو کہ تمہاری کون سی سہیلی ایسی ہے بس پھر اسی کے بارے میں لکھ لو۔" انہوں نے اپنی بات مکمل کی۔ مینا اپنی نوٹ بک ہاتھ میں لیے باغ میں آگئی اور پھر سے سوچنے لگی۔ بہت دیر سوچنے کے بعد اس نے کاپی پر دو تین فقرے لکھے لیکن فوراً ہی انہیں مٹا

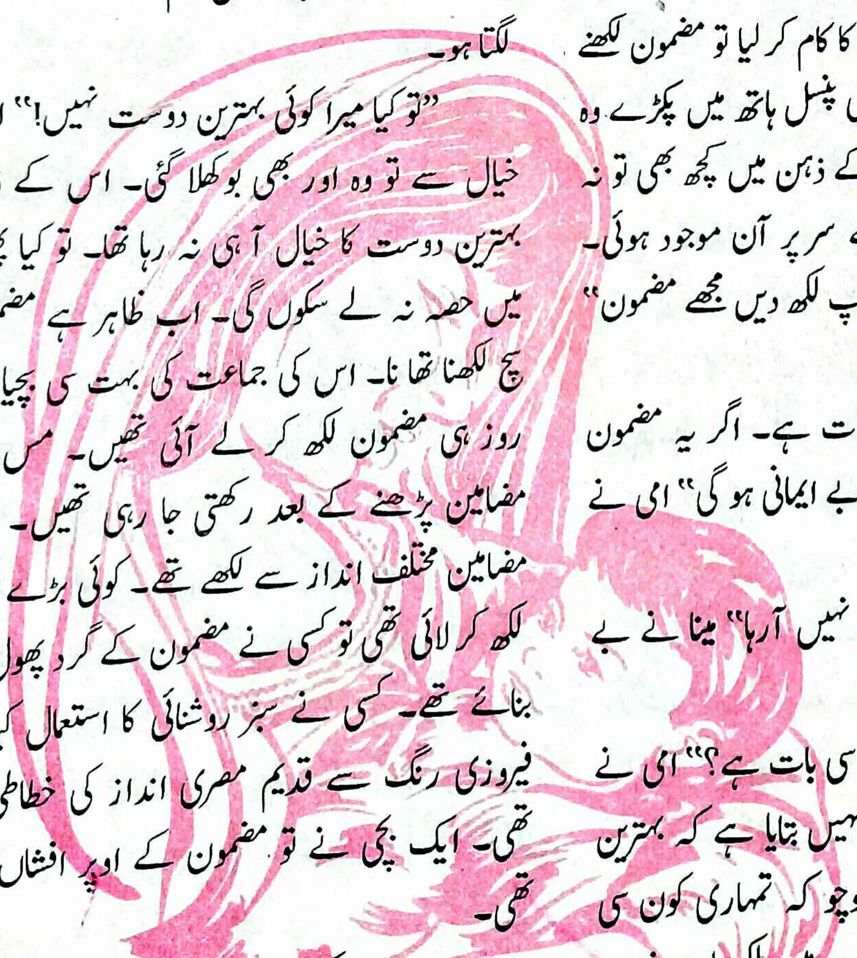

ڈالا۔ پھر منگل' بدھ اور جمعرات کے دن بھی اسی سوچ بچار میں گزر گئے۔ بہترین دوست سے اس کے ذہن میں سب سے پہلے ندا کا خیال آیا۔ ندا ویسے تو اس کی سب سے پکی سہیلی تھی مگر پھر اس نے راحیلہ کی بات پر مینو کی ہنسی کیوں اڑائی تھی۔ ویسے بھی مینو ندا سے اپنے دل کی بات نہ کہہ سکتی تھی۔ ندا کے بعد عائشہ کی باری آئی' پھر ریحانہ' پھر فائزہ اور کرن۔ ان کے بعد پڑوس میں رہنے والے مانی اور بلو اور پھر ننھا دانی بھی' لیکن ان سب میں کوئی بھی بہترین دوست کے خاکے پر پورا نہ اترتا تھا۔ وہ ان سب کے بغیر اداس تو ہو ہی جاتی تھی لیکن دل کی بات تو ان میں سے کسی سے نہ کہہ سکتی تھی۔ اور ننھا دانی تو ابھی اس کی بات سمجھ بھی نہ سکتا تھا۔ باقی سب میں سے وہ کون تھا جو ہمیشہ اس کا ساتھ دے اور مصیبت میں کام آئے اور جو اسے بہت اچھا لگتا ہو۔

"تو کیا میرا کوئی بہترین دوست نہیں!" اس ہول ناک خیال سے تو وہ اور بھی بوکھلا گئی۔ اس کے ذہن میں کسی بہترین دوست کا خیال آ ہی نہ رہا تھا۔ تو کیا پھر میں مقابلے میں حصہ نہ لے سکوں گی۔ اب ظاہر ہے مضمون بھی تو سچ سچ لکھنا تھا نا۔ اس کی جماعت کی بہت سی بچیاں تو بدھ کے روز ہی مضمون لکھ کر لے آئی تھیں۔ مس رابعہ یہ تمام مضامین پڑھنے کے بعد رکھتی جا رہی تھیں۔ بچیوں نے یہ مضامین مختلف انداز سے لکھے تھے۔ کوئی بڑے رنگین گتے پر لکھ کر لائی تھی تو کسی نے مضمون کے گرد پھول دار حاشیے بنائے تھے۔ کسی نے سبز روشنائی کا استعمال کیا تھا اور کوئی فیروزی رنگ سے قدیم مصری انداز کی خطاطی کر کے لائی تھی۔ ایک بچی نے تو مضمون کے اوپر افشاں بھی بکھیر دی تھی۔

یہ سب دیکھ کر مینا کچھ پریشان سی ہو گئی تھی۔ اس نے تو ابھی تک مضمون لکھا ہی نہیں تھا۔ جمعرات کے دن آخری پیریڈ میں مس نے فہرست میں سے ان تمام بچیوں کے نام پکارے جو مضمون لکھ کر لائیں تھیں۔ جس جس بچی

بہترین دوست

بخت رسا

آدھی چھٹی کے بعد پانچویں جماعت کی استانی مس ہما تیسری جماعت کے کمرے میں آئیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ تیسری چوتھی اور پانچویں جماعت کی بچیوں کے درمیان مضمون نویسی کا مقابلہ ہو رہا ہے جس کا موضوع ہے۔ "میری بہترین دوست"۔ اس مقابلے میں جو بچی بھی چاہے وہ حصہ لے سکتی ہے لیکن ہر جماعت میں سے صرف دس بچیوں کے مضامین مقابلے میں شامل کیے جائیں گے۔ جس بچی نے بھی مقابلے میں حصہ لینا ہے وہ ہفتے کے دن تک مضمون لکھ کر لے آئے۔ اسی دن تمام مضامین کی پڑتال ہو گی اور انعام کی حق دار کا فیصلہ ہو گا۔ مس ہما اعلان کر کے چلی گئیں تو مس رابعہ بولیں "اچھی بچیو! تم میں سے جو بچیاں مقابلہ میں حصہ لینا چاہتی ہیں' اپنی پوری کوشش سے مضمون لکھ کر لائیں۔ میں ان تمام مضامین میں سے دس بہترین مضمون مقابلے کے لیے بھیجوں گی"۔

سب بچیاں خاموشی سے مس کی بات سن رہی تھیں۔

"مس مضمون میں کیا لکھنا ہے؟" جماعت میں اول آنے والی راحیلہ نے اچانک پوچھا۔

"شاباش راحیلہ' یہ بات بھی جاننا بہت ضروری ہے" مس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر بولیں "سب سے پہلے تو یہ مضمون حقیقت پر مبنی ہونا چاہیے"۔

"حقیقت پر مبنی! کیا مطلب مس؟" ردا نے پوچھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ مضمون میں سب باتیں سچ لکھنی ہیں اور یہ کہ مضمون کسی ایسے انسان کے بارے میں ہونا چاہیے جو واقعی آپ کا دوست ہو۔ کسی خیالی دوست یا جانور یا کسی اور چیز کے بارے میں مضمون نہیں لکھنا" مس رابعہ نے وضاحت کی۔

"مس انعام میڈم دیں گی؟" جماعت میں سے کسی نے پوچھا۔

"جی ہاں' بالکل!" مس نے کہا۔

"انعام میڈم دیں گی" مینا ایک دم چونکی "میں بھی مضمون لکھوں گی!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہونہہ! مضمون لکھے گی! املا تو یاد کرتی نہیں!" راحیلہ نے منہ موڑ کر مینو کا مذاق اڑایا۔ راحیلہ کی بات سن کر اردگرد بیٹھی بچیاں ہنسنے لگیں۔ مس رابعہ راحیلہ کا فقرہ نہ سن سکی تھیں' نہیں تو وہ اس گھمنڈی بچی کی خوب خبر لیتیں۔ لیکن مینو کا دل ایک دم ٹوٹ سا گیا۔ اس نے بہت شکوے سے راحیلہ اور اپنی پکی سہیلی ندا کی طرف دیکھا۔ کیوں کہ مینو کی بات پر سب سے زیادہ راحیلہ ہی ہنسی تھی۔

ڈالا' کئی آدمیوں کو زخمی کیا اور تم نے اس کا پیچھا کر کے بڑی مشکل سے اسے گرفتار کیا؟"

"مائی لارڈ' یہ سب باتیں بالکل ٹھیک ہیں۔ گواہوں نے ان سب کو ٹھیک بتایا ہے" انسپکٹر نے جواب دیا۔

"ٹھیک' لیکن انسپکٹر صاحب اس ملزم کی جسمانی حالت سے تو یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ بہادری کا ایسا کام کر سکتا ہے۔ یہ تو ایسا کمزور ہے کہ آسانی سے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ڈاکہ ڈالنے' کئی آدمیوں کو زخمی کرنے اور پھر وہاں سے بھاگنے کا کام کوئی طاقت ور آدمی ہی کر سکتا ہے؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"سرکار والا' یہ عادی مجرم بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ اس کے دبلا پتلا ہونے پر نہ جائیے۔ یہ بہت نڈر اور پھرتیلا ہے" انسپکٹر نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

انسپکٹر کی یہ بات سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ جس آدمی کو وہ بہت طاقت ور اور پھرتیلا بتا رہا تھا وہ اس قدر کمزور تھا کہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ اس کے گال پچکے ہوئے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ایک بیوقوف بھی کہہ سکتا تھا کہ یہ آدمی بھرے بازار میں ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔ مجھے گواہوں پر بھی شک ہوا۔ ان میں ایک ایسا تھا جسے میں نے کئی بار کچہری میں دیکھا تھا۔ ایسے گواہوں کو پولیس کا ٹاؤٹ کہا جاتا ہے۔ وہ کچھ رقم لے کر جھوٹی گواہی دینے پر تیار ہو جاتے ہیں اور ان سے مدد لے کر بعض پولیس والے بے گناہوں کو سزا دلوا دیتے ہیں۔ میں نے اس گواہ سے پوچھا "تم خدا کو حاضر ناظر جان کر ایک بار پھر کہو کہ تم نے اس شخص کو جس کا نام حبیب الرحمان ولد نجیب الرحمان ہے ڈاکہ ڈالتے' لوگوں کو زخمی کرتے اور فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا!"

وہ جلدی سے بولا "مائی لارڈ' میں حلف اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اسے ڈاکہ ڈالتے' لوگوں کو زخمی کرتے اور وہاں سے فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ مائی لارڈ' بہت خطرناک ڈاکو ہے یہ"۔

"ٹھیک' اچھا یہ بتاؤ کیا تم نے کسی اور مقدمے میں بھی گواہی دی ہے؟ ہمارا مطلب ہے تم پیشہ ور گواہ تو نہیں ہو جو اپنی فیس لے کر گواہی دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں!"

میرا یہ سوال سن کر وہ گھبرا گیا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی گھبراہٹ اس بات کا ثبوت تھی کہ اس نے جھوٹی گواہی دی ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ پولیس والے ایک بے گناہ شخص کو پکڑ لائے ہیں اور اپنے نمبر بنانے کے لیے سزا دلوا رہے ہیں۔ میں نے دیکھا ملزم بہت حیران ہو کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔

بالکل ٹھیک انصاف کرنے کے خیال سے میں نے پورے معاملے پر ایک بار اور غور کیا۔ مقدمے کے خاص کاغذات دوبارہ پڑھے اور اس کے بعد پیش کار سے کہا "شیخ صاحب' اس ملزم کا مقدمہ کچھ ایسا ہے کہ شاید ہم پورا پورا انصاف نہ کر سکیں گے۔ آپ یوں کیجئے کہ اس کا کیس کسی اور عدالت میں بھیج دیجئے اور سرکار کی طرف سے اس کے لیے ایک اچھے سے وکیل کا انتظام بھی کر دیجئے۔ لگتا ہے یہ اپنی صفائی پیش کرنے کے قابل نہیں ہے"۔

یہ حکم دے کر میں نے طبیعت ٹھیک نہ ہونے کا کہہ کر عدالت برخاست کر دی اور گھر آ گیا۔ پولیس والوں کی ایسی بے اصولی دیکھ کر میری طبیعت واقعی خراب ہو گئی تھی۔ میرا دل رنج سے بھر گیا تھا۔

میری توقع کے مطابق دوسرے جج صاحب نے پہلی پیشی پر ہی ملزم کو باعزت بری کر دیا۔ ساتھ ہی بے ایمانی کرنے والے پولیس والوں کے خلاف مقدمہ چلانے کا حکم بھی دیا۔ میں نے یہ انتظام کر دیا تھا کہ میرے بھائی حبیب الرحمان کو رہائی ملے تو اسے میرے گھر پہنچا دیا جائے اور اب وہ ایک معزز مہمان کی حیثیت سے میرے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ نہلا دھلا کر اسے صاف ستھرا لباس پہنا دیا گیا تھا۔ رہنے کے لیے صاف ستھرا کمرا دیا گیا تھا اور آرام پہنچانے کا سارا انتظام کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس سارے انتظام کے باوجود وہ بجھا بجھا اور شرمندہ شرمندہ تھا۔ اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جس جج نے اس کی مدد کی اور سزا سے بچایا ہے

چہرے پر مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ واقعی امی نے ٹھیک کہا تھا۔ جس بہترین دوست کے بارے میں وہ لکھنا چاہتی تھی اس کا خیال ایک دم سے ہی آگیا تھا۔ وہ فوراً اٹھی اور بستے میں سے کاپی پنسل نکالی۔ لیکن کاپی کھولی تو اس میں صرف آخری 3 صفحے خالی تھے۔ اس کا دل پھر سے بجھنے لگا۔ خیر میرا مضمون کون سا اتنا لمبا ہو گا اس نے خود کو تسلی دی اور لکھنے لگی۔ جب مینا کو کمرے سے گئے 15 منٹ ہو گئے تو ابو جان بہت تشویش میں بستر سے نکلے۔ اسے ڈھونڈتے جب وہ مہمانوں کے کمرے میں آئے تو مینا اپنی کاپی پر جھکی کچھ لکھ رہی تھی۔ "مینو گڑیا! اس وقت کیا کام کر رہی ہو؟" انہوں نے قریب آکر پوچھا۔

"ابو جان مضمون لکھ رہی ہوں، بس تھوڑا ہی رہ گیا ہے" مینا نے جھکے جھکے جواب دیا تو ابو اس کے قریب ہی دوسرے صوفے پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگے۔ کچھ دیر بعد مینا نے اپنی کاپی ان کے آگے کر دی اور کہنے لگی "ابو جان پلیز

دیکھیں مضمون میں کوئی غلطی تو نہیں"۔

ابو نے بہت شوق سے مضمون پڑھا پھر اس کے ہاتھ سے ربڑ پنسل لے کر املا کی تین چار غلطیاں درست کر کے بولے "واہ مینو واقعی بہت پیارا مضمون لکھا ہے"۔

مینا کا دل چاہا ابو سے پوچھے کہ کیا اس کے مضمون کو انعام مل سکتا ہے۔ لیکن وہ جھینپ گئی اور صرف مسکرا دی۔ اگلی صبح جب مس رابعہ حاضری لے چکیں تو مینا اپنی کاپی لے کر ان کے پاس گئی "مس میرا مضمون" وہ کاپی انہیں تھماتے ہوئے کہنے لگی۔

"مس مینا کا مضمون بھی سنائیں" راحیلہ صاحبہ نے فرمائش کی۔ مس رابعہ نے پہلے مضمون خود پڑھا، پھر کلاس کو بھی سنایا۔ بچیوں نے یہ مضمون کچھ تعجب سے سنا کیوں کہ یہ مضمون کچھ مختلف سا محسوس ہو رہا تھا۔ راحیلہ حسب عادت مذاق اڑانے کے انداز میں مینا کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ بے چاری ریحانہ کا منہ حیرت سے اور بھی گول ہو گیا اور اس نے کندھے اچکائے تو راحیلہ کو کھل کر ہنسنے کا موقع مل گیا۔ "راحیلہ تمیز کے دائرے میں رہو۔ یہ کس بات پر دانت نکال رہی ہو"۔ مس رابعہ نے اسے سختی سے ڈانٹا۔

"مس یہ ریحانہ مجھے منہ چڑا رہی ہے" راحیلہ نے اپنی غلطی چھپانے کے لیے کہا۔

"نہیں مس میں یہ کہہ رہی ہوں کہ کیسا عجیب مضمون لکھا ہے مینو نے" راحیلہ کے سفید جھوٹ پر ریحانہ نے سٹ پٹا کر کہا"۔

"ارے اس میں عجیب بات کیا ہے؟ باقی سب بچیوں نے اپنی مرضی کے مضمون لکھے ہیں، مینا نے بھی وہی لکھا ہے جو لکھنے کو اس کا دل کر رہا تھا"۔ مس نے اطمینان سے جواب دیا اور پھر مقابلے میں شرکت کے لیے چنے ہوئے مضامین آپا جی کے ہاتھ میڈم کے دفتر میں بھجوا دیئے۔

"مس نے مینا کی کاپی مقابلے کے لیے نہیں بھیجی" آپا جی کے جانے کے بعد عائشہ نے باقی بچیوں کو بتایا۔

"تمہیں کیسے پتا ہے؟" مینا نے سٹ پٹا کر پوچھا۔

"ایسے پتا ہے جی' کیوں کہ جی' تمہارا مضمون ایسا تھا ہی نہیں جی!" راحیلہ حسب عادت اپنے مخصوص انداز سے بولی۔

"نہیں بھئی' اچھا تو تھا اس کا!" ریحانہ جو واقعی بہت دوستانہ طبیعت رکھتی تھی' مینا کا ساتھ دیتے ہوئے بولی۔ اس وقت مس نے سب بچیوں کو خاموش رہنے کے لیے کہا۔ آج چوں کہ ہفتے کا دن تھا' اس لیے چھٹی بھی جلدی ہونا تھی۔ ابھی تیسرا پریڈ ہی گزرا تھا کہ مس نے سب بچیوں کی قطار بنوائی اور انہیں اپنے ہمراہ اسکول کے بڑے ہال میں لے آئیں۔ مینو کا دل ہال میں جانے کو بالکل نہ کر رہا تھا۔ ظاہر ہے مس نے اس کا مضمون پسند جو نہ کیا تھا۔ ہال میں جا کر معلوم ہوا کہ یہاں تو سارا اسکول موجود ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں سب بچیوں کو ہال میں لگی کرسیوں پر بٹھا دیا گیا' مینو بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ بجھے دل سے بیٹھ گئی اور ہال کی اونچی چھت کو گھورنے لگی۔ "یہ بڑی کلاسیں کیوں آئی ہیں؟" مینا کے برابر بیٹھی میمونہ نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

"اوئے بے وقوف! ان لوگوں کے بھی تو مقابلے ہوئے ہیں!" عائشہ نے میمونہ کی کم عقلی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ مینو نے بے زاری سے ان دونوں کو دیکھا "ہونہہ کیا فائدہ!" اس نے دل میں سوچا۔ وہ سخت افسردہ تھی۔ مس نے اس کا مضمون مقابلے میں شامل کرنے کے قابل بھی نہ سمجھا تھا۔ ابو تو کہہ رہے تھے بہت پیارا ہے۔ اگر وہ کاپی کی بجائے رنگین گتے پر مضمون لکھ لیتی تو شاید.... لیکن اس نے تو مضمون رات کو ہی لکھا تھا۔ اسے اپنے کوٹ کے کالر میں لگا ریشمی کپڑا چبھنے لگا۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ کوٹ اتار کر دور پھینک دے۔ اسی وقت آٹھویں جماعت کی استانی نے آکر اسٹیج پر سب بچیوں کو خاموشی اختیار کرنے کو کہا۔ کیوں کہ ہیڈ مسٹرس صاحبہ اسکول کی سابقہ ہیڈ مسٹرس کے ہمراہ تشریف لا رہی تھیں۔ چند ہی لمحوں بعد میڈم' پہلی ہیڈ مسٹرس صاحبہ کے ساتھ ہال کے بڑے دروازے سے داخل ہوئیں۔ تمام بچیوں اور استانیوں نے تالیاں بجاتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ نویں جماعت کی کپتان نے مہمان کو پھول پیش کیے۔ جب مہمان اور میزبان ہیڈ مسٹرس اسٹیج پر پہنچ گئیں تو دسویں جماعت کی ایک طالبہ نے تلاوت کلام پاک کی اور پھر قومی ترانہ بجایا گیا۔ اس کے بعد دسویں کی کپتان نے مہمان خصوصی کو خوش آمدید کہا اور تقریب شروع کرنے کی اجازت مانگی۔ پھر مضمون نویسی کا مقابلہ جیتنے والی بچیوں میں تعریفی اسناد کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے نویں اور دسویں جماعت میں اول دوم اور سوم آنے والی بچیوں کو تعریفی اسناد دی گئیں پھر اول اور دوم آنے والے مضامین سنائے گئے۔ پھر چھٹی ساتویں اور آٹھویں جماعت میں مضمون نگاروں کو حوصلہ افزائی کی اسناد اور دوم اور سوم آنے والی بچیوں کو تعریفی اسناد دینے کے بعد پہلے کی طرح ہی 1 اور 2 نمبر پر آنے والے مضامین پڑھے گئے۔ اسناد پانے والی بچیاں اپنے نام کا اعلان ہونے پر اسٹیج پر جاتیں اور تالیوں کی گونج میں مہمان خصوصی سے اپنی سندیں لیتیں اور خوشی خوشی اپنے دوستوں کے درمیان آکر بیٹھ جاتیں۔ لیکن مینو کو کچھ خاص مزا نہ آرہا تھا۔ وہ مہمان ہیڈ مسٹرس صاحبہ کی سلیٹی ساڑھی پر غور کر رہی تھی جو اسے ان کے کھچڑی بالوں کے ساتھ بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی اور جب تک تیسری چوتھی اور پانچویں جماعت کی حوصلہ افزائی کی اسناد دی گئیں' مینو خاصی بور ہو چکی تھی۔ جونہی تیسرے نمبر پر آنے والی مضمون نگار بچی کے نام کا اعلان ہوا تو راحیلہ ریحانہ سے بولی "دیکھا مجھے ضرور پہلا یا دوسرا انعام ملے گا!"

ریحانہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ مینو کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے بالوں سے دونوں ربن اتار کر پھینک دے اور اسٹیج پر پڑی مخمل کی گدیلی کرسیوں پر جا کر اوندھے منہ لیٹ جائے۔ اسی وقت چوتھی جماعت کی سب سے ذہین طالبہ "طاہرہ اسد" کا نام پکارا گیا۔ طاہرہ کو دوسرا انعام ملا تھا۔ ہمیشہ بہت صاف ستھری رہنے والی طاہرہ اسد مینا کو بہت

اچھی لگتی تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ کچھ جوش سے تالیاں بجائیں لیکن جب طاہرہ کا لکھا مضمون سنا جانے لگا تو مینو دوبارہ سے بے زار ہونے لگی۔ سنائے جانے والے مضمون کم و بیش ایک سے ہی تھے۔ وہ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"دیکھنا میرا مضمون پہلے نمبر پر ہو گا" راحیلہ نے پھر سے اترا کر کہا۔

"ظاہر ہے!" مینا نے بے زاری سے سوچا اور میڈم کے کندھے پر لگے جھل مل کرتے پھول نما بلے کو دیکھنے لگی۔ اس میں سے بالکل ویسی کرنیں نکل رہی تھیں جیسی امی کی ستاروں والی قمیص سے۔ امی کی قمیص کا خیال آتے ہی اسے اپنی گڑیا کا فراک یاد آگیا "وہ میں نے کہاں رکھ دیا....." وہ اپنے ذہن پر زور دینے لگی۔

"مینا! مینا! جاؤ بھی تمہیں بلا رہے ہیں!" ریحانہ اور میمونہ نے کرسی پر نیم دراز مینا کو جھنجھوڑا تو وہ چونک گئی۔

"مینا الماس!" کپتان نے اس کا نام پھر سے پکارا۔ مینا اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑی ہوئی "ہیں! مجھے کیوں بلایا ہے!" اس نے مس رابعہ کی طرف دیکھا جو بہت خوشی اور جوش سے اس طرف اپنا ہاتھ بڑھائے کھڑی تھیں۔ "مینا بیٹے آؤ نا!" مس اسے باقی بچوں کے درمیان میں سے اٹھاتے ہوئے بولیں۔

"مس میں!" مینا کو تالیوں کی گونج میں کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی۔ پھر اس نے خواب کی سی کیفیت میں مس کا ہاتھ تھام کر سیڑھیاں عبور کیں اور اسٹیج پر آگئی۔ ہوش تو اسے اس وقت آیا جب مہمان خصوصی نے سنہری حروف میں چھپی سند اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس نے مضمون نویسی کا مقابلہ جیت لیا تھا۔ بے یقینی کے عالم میں اسے کسی بات کا پتا نہ چل رہا تھا۔ وہ سند لے کر فوراً مڑنے لگی تو دسویں کی کپتان نے اس کا بازو بہت پیار سے پکڑ کر اپنے قریب روک لیا۔ ابھی اس کا مضمون بھی پڑھ کر سنایا جانا تھا۔ اس کا اول نمبر پر آنے والا مضمون' وہی مضمون جو سن کر راحیلہ ہنسی تھی۔ کپتان مضمون سنانے لگی تو میڈم خود اٹھ کر پاس آگئیں' اور کپتان کے ہاتھ سے مینا کی کاپی لے لی۔ پھر بولیں

"مینا الماس کا مضمون میں آپ لوگوں کو خود پڑھ کر سناؤں گی"۔ کپتان دم سادھے مینا کے ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ میڈم نے مضمون پڑھنا شروع کیا۔

"میری بہترین دوست' بہترین دوست وہ ہوتا ہے جس کے ہم بھی بہترین دوست ہوں۔ بہترین دوست کو ہم اپنے دل کی ہر بات سچ سچ بتا سکتے ہیں اور بہترین دوست ہمیشہ ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ ہمیں برے کام نہیں کرنے دیتا' اور اچھے کام کرنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ میں بھی اپنی بہترین دوست کی بہترین دوست ہوں' مجھے ان سے بہت محبت ہے اور وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ وہ میرا ہر کام خود اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں' وہ میری ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہیں۔ میں بھی ان کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہوں' اور ان کا ہر حکم مانتی ہوں۔

وہ مجھے گندے کام نہیں کرنے دیتیں اور ہمیشہ اچھے کام کرنے کو کہتی ہیں۔ میری بہترین دوست میری کلاس میں نہیں پڑھتیں۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑی ہیں۔ لیکن میں ان کے بغیر بہت اداس ہو جاتی ہوں۔ جب میں ان کے ساتھ ہوتی ہوں تو مجھے اور کسی دوست کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ صرف وہی میری بہترین اور سچی دوست ہیں۔ میری بہترین دوست میری پیاری امی جان ہیں"۔

میڈم نے مضمون پڑھ لیا تو ہال ایک مرتبہ پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ جب تالیوں کا شور ذرا کم ہوا تو میڈم دوبارہ بولیں "اس مضمون میں مینا الماس نے جس ہستی کو اپنی بہترین دوست کہا ہے اسی کی بدولت مینا کے مضمون کو اول قرار دیا گیا ہے اور آج میں آپ سب کو خاص طور پر مینا الماس کو یہ بات بتانا چاہوں گی کہ میں نے آج جو مقام حاصل کیا ہے اور جو مجھے اس بڑے ادارے کی صدر معلمہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے' اس کی وجہ بھی صرف یہ ہے کہ میری بہترین دوست بھی مینا الماس کی طرح ہمیشہ سے میری پیاری امی جان رہی ہیں"۔

کپتان نے مسکراتے ہوئے بہت محبت سے جھک کر مینا کو پیار کیا تو مینا نے بھی بہت اپنائیت سے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

قاتل کے وکیل نے سعید کی ماں سے رابطہ کیا تھا اور معافی نامے پر دستخط کر دینے کے عوض ایک لاکھ روپے کی پیش کش کی تھی۔ مگر اس کی ماں نے انکار کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تیرنے والے آنسو جو بیٹے کی وفات کے بعد کبھی خشک نہیں ہوئے تھے، انکار کے وقت آنکھوں سے ایک بار پھر چھلک پڑے تھے۔ وکیل جو کئی بار اس سلسلے میں ان کے گھر آچکا تھا آج پھر حسب معمول ناکام واپس لوٹ گیا۔

"ایک لاکھ کیا وہ اگر ایک کروڑ بھی دیں تو میں اپنے بیٹے کے قاتل کو معاف نہیں کروں گی، نہیں معاف کروں گی وکیل صاحب، نہیں معاف کروں گی" اس کی آواز یہ کہتے ہوئے بین کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اس کے بیٹے کو قتل ہوئے ایک سال ہی تو ہوا تھا۔ بیٹے کی جدائی کا صدمہ ماں کے دل سے آخری سانسوں تک ختم نہیں ہو سکتا، اور پھر فرماں بردار اور بے گناہ بیٹے کی ناگہانی موت تو دن کا چین اور رات کی نیند اڑا دیتی ہے۔

ڈاکو جب مسافروں کو لوٹ رہا تھا تو اس کے بیٹے نے صرف اتنا ہی تو کہا تھا کہ میں نے تجھے پہچان لیا ہے اور پھر اسے یہ ایک جملہ کہنے کی سزا یہ ملی تھی کہ اس کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ ماں کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ اس کا لخت جگر منوں مٹی کے نیچے سویا ہوا تھا مگر اسے ایک پل نیند نہیں آتی تھی۔ اگرچہ ڈاکو نہ صرف پکڑا گیا تھا بلکہ اسے عمر قید کی سزا بھی ہو گئی تھی مگر قاتل کو سزا مل جانے سے اسے اپنا جگر گوشہ تو نہیں مل سکتا تھا۔

میں نے جب اماں بشیراں کو دیکھا کہ وکیل کے جانے کے بعد وہ بے صبری سے رو رہی ہیں بلکہ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی ہے اور وہ چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہیں تو انہیں دلاسہ دینے کے لئے میں ان کے پاس چلی گئی۔ مجھے اس کام میں کالج سے دیر ہو گئی تھی مگر اس سے جو دلی سکون ملا تھا وہ شاید مجھے بروقت کالج پہنچ جانے سے بھی نہ نصیب ہوتا۔

اماں بشیراں ہماری ہمسائی تھیں۔ ایک سال پہلے اس کا بیٹا قتل ہو گیا تھا۔ اماں بشیراں کے گھر اور ہمارے گھر کے درمیان موجود دیوار زیادہ اونچی نہ تھی۔ کھڑے ہو کر ایک دوسرے کے گھر کے صحن بلکہ صحن کے فرش تک کو دیکھا جا سکتا تھا۔ میں اکثر اماں بشیراں کا غم غلط کرنے کے لیے ان کے گھر چلی جاتی تھی اور اگر کبھی دیوار پر سے اماں کو غم سے بے حال ہوتے دیکھتی تو تب بھی جا کر ان کی ڈھارس بندھا دیتی۔ آج بھی وکیل کے جانے کے بعد میں نے حسب معمول ایسا ہی کیا تھا۔

میرا نام مروہ ہے اور میں ان دنوں ایف اے میں پڑھتی ہوں۔ مجھے کالج تک جانے کے لیے تقریباً پانچ کلو میٹر کا سفر وین میں کرنا پڑتا ہے۔ اسٹاپ سے کچھ فاصلے پر میرا کالج ہے۔ ہمارے کالج کے راستے میں ایک جیل بھی آتی ہے۔ میرے ساتھ میری دو کلاس فیلو زوبیہ اور مناہل ہوتی ہیں۔ ویگن ہمیں جس اسٹاپ پر اتارتی ہے اس سے آگے ایک کلو میٹر کا سفر ہمیں پیدل طے کرنا پڑتا ہے۔ گرمیوں میں ہمیں یہ سفر کافی مشکل لگتا ہے اور جن دنوں کا یہ واقعہ میں آپ کو سنا رہی ہوں وہ بھی گرمیوں کے ہی دن تھے اور گرمیوں کی چھٹیاں ہونے میں ابھی چند دن باقی تھے۔

تین چار روز سے ایک بوڑھی اماں سے ہماری روزانہ ملاقات ہو رہی تھی۔ وہ لاٹھی کے سہارے سے بھی مشکل سے چلتی تھیں اور ان کے چہرے پر جھریوں کا یہ عالم تھا کہ پسینہ جھریوں میں ہی اٹکا چمک رہا ہوتا۔ بوڑھی اماں کے کپڑے بھی پھٹے پرانے محسوس ہوتے۔ پاؤں میں جوتے بھی پھٹے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ٹفن اور ایک شاپر ہوتا تھا۔ وہ روزانہ ہمارے ساتھ وین میں سوار ہوتیں اور پھر وین سے اتر کر جیل تک پیدل ہمارے ساتھ آتیں۔ ویگن سے اترتے ہی وہ ہمیں کہتیں "بیٹی مجھے بھی سڑک پار کروا دو"۔ اور اکثر یہ کار خیر مناہل ہی انجام دیتی۔

ایک دن ہمارا ایک پریڈ فارغ تھا۔ ہم تینوں ان اماں پر تبصرہ کرنے لگ گئیں کہ وہ پتا نہیں کہاں سے آتی ہیں اور جیل میں کس سے ملتی ہیں۔ زوبیہ کہنے لگی "آج بھی تو اماں ہمیں ملیں گی، ہم ان سے پوچھ لیں گے کہ وہ کہاں سے آتی ہیں اور کدھر جاتی ہیں؟"

مناہل بولی "وہ یقیناً کسی کا کھانا لے کر آتی ہو گی۔ اس کے ہاتھ میں ٹفن بھی تو ہوتا ہے"۔

"ہو سکتا ہے اس کا کوئی عزیز جیل میں سزا کاٹ رہا ہو" میں نے سوچا۔

آج ہماری نظریں اسٹاپ پر آتے ہی اماں کو تلاش کرنے لگ گئیں۔ ویگن آنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے کہ وہ اماں بھی وہاں پہنچ گئیں۔

وین میں صرف چار مسافروں کی جگہ تھی اور اتفاق سے اسٹاپ پر بھی ہم چاروں مسافر ہی تھے۔ ہم چاروں سب سے پچھلی سیٹ پر ایک ساتھ بیٹھ گئے۔ جب اپنے اسٹاپ پر اترے تو اماں کے ہاتھ میں سے شاپر گر گیا۔ میں نے شاپر پکڑ کر اماں کو پکڑا دیا اور ساتھ ہی پوچھا "اماں جی، آپ روزانہ کدھر جاتی ہیں؟"

"بیٹی تجھے کیا بتاؤں میں دکھیاری نصیبوں کی ماری، صبح ناشتہ کرنے لگتی ہوں تو میرا نوالہ حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ پھر جب میرا بھوک سے برا حال ہونے لگتا ہے تو میں یہاں آکر جیل کی دیوار کے ساتھ لگ کر زہر مار کر لیتی ہوں اور گھنٹوں جیل کی دیواروں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہوں"۔

میں نے حیرت سے پوچھا "اماں یہ کیا بات ہوئی، آپ گھر بیٹھ کر ناشتہ کرنے کے بجائے جیل کے قریب بیٹھ کر کیوں کرتی ہیں؟"

اماں نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا "ارے بیٹی' تم کیا جانو' یہ بات تو کسی ماں کی سمجھ میں ہی آسکتی ہے۔ تم تو ابھی بچیاں ہو"۔

"اماں اپنا دکھ ہمیں بھی تو بتاؤ" زوبیہ نے کہا۔

"بیٹی' یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں سنانے بیٹھ گئی تو تم کالج نہ جاپاؤ گی"۔

مناہل بولی "اماں آج ہمارے پہلے تین پریڈ خالی ہیں آپ ہمیں آج یہ داستان ضرور سنائیں"۔

"آؤ بیٹا بیٹھ جاؤ۔ میں آپ کو اپنی دکھ بھری داستان سنا ہی دیتی ہوں۔ ہو سکتا ہے اس سے آپ کو کوئی سبق ہی مل جائے۔

"میرا ایک ہی بیٹا ہے جس کا نام ہے کرم الٰہی۔ جب وہ ایک سال کا تھا تو اس کا باپ فوت ہو گیا۔ والد کی وفات کے ایک ماہ بعد میرا کرم الٰہی بیمار ہو گیا۔ میں اسے ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے شہر لے کر آرہی تھی کہ اجاڑ بیابان جگہ پر وین کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ اب جو بھی وین قریب سے گزرتی وہ مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوتی۔ میں کبھی کرم الٰہی کو چپ کراتی تو کبھی وین دیکھتی۔ یا اللہ کوئی تو وین ہو جس میں کھڑے ہونے کی جگہ ہی مل جائے۔

اسی دوران میں کرم الٰہی نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ مجھے بہت پیاس لگی ہوئی تھی۔ پھر میرا گلا خشک ہو گیا اور کھانسی آنے لگ گئی۔ حلق بالکل خشک ہو گیا تھا۔ میں کھانستے ہوئے ادھر ادھر پانی کو دیکھنے لگی۔ بالآخر میں نے ایک کھیت میں گندا سا پانی دیکھا اور چلو بھر کر پی لیا۔ ابھی میں کچھ سنبھلی ہی تھی کہ ایک وین آئی اور میں اس میں پھنس کر کھڑی ہو گئی۔ بیٹا اس طرح کی سینکڑوں مشکلوں اور مصیبتوں کے واقعات ہیں جو کرم الٰہی کو پالنے پوسنے میں میرے ساتھ پیش آئے۔ خیر ان مشکل میں سے گزر کر میں کرم الٰہی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر آئی۔ اور چیک کروانے کے بعد اسے گھر لے کر آئی۔

پھر وقت گزرتا گیا۔ کرم الٰہی پانچ سال کا ہو گیا۔ میں نے اسے اسکول میں داخل کروا دیا۔ وہ پندرہ سال تک تو میرا بہت ہی فرماں بردار رہا۔ میں محنت مزدوری کر کے اسے تعلیم دلوا رہی تھی۔ لیکن جب میں تصور میں اپنے کرم الٰہی کو مستقبل کا ڈاکٹر دیکھتی تو مجھے سب مشکل وقت بھول جاتا۔

کرم الٰہی نے میٹرک میں بڑے اچھے نمبر حاصل کیے پھر ایف ایس سی کرنے کے لئے کالج میں داخل ہو گیا۔ بدقسمتی سے اسے کالج میں اچھا ماحول نہ ملا اور وہ آوارہ لڑکوں کے ساتھ چلنے پھرنے لگ گیا۔ وہ صبح گھر سے جاتا اور شام کو لوٹتا۔ وہ راہ چلتی عورتوں کے پرس چھین لیتا۔ ویگنوں اور خوانچہ فروشوں سے بھتہ وصول کرتا اور اپنے آوارہ گرد دوستوں کے ساتھ جا کر فلمیں دیکھتا۔

کافی وقت گزر گیا۔ میرے سب شوق میرے اندر ہی دفن ہو کر رہ گئے۔ کرم الٰہی پڑھ لکھ کر ڈاکٹر نہ بن سکا۔ وہ گھر آتا تو مجھے برا بھلا کہتا اور باہر جاتا تو شریف لوگوں کو تنگ کرتا۔ اب وہ کرم الٰہی سے کرمو بدمعاش کا روپ دھار چکا تھا۔ میں نے کبھی اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کہاں سے آئے ہو اور کدھر جا رہے ہو۔ کیوں کہ وہ یہ پوچھنے پر مجھے ڈانٹ دیتا تھا۔

میں لوگوں کے گھر کام کرتی اور اپنا پیٹ پالتی مگر وہ جب گھر آتا تو میں جو کچھ کما کر لائی ہوتی وہ مجھ سے لے جاتا۔ لیکن اس کے باوجود اگر کسی دن وہ مجھے برا بھلا کہنے یا مجھ سے پیسے لینے نہ آتا تو میں دروازے میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتی کہ آج میرا کرم الٰہی نہیں آیا۔ پتا نہیں اس نے ناشتہ کیا ہو گا کہ ابھی تک بھوکا ہی ہو گا۔ بیٹی وہ آتا تو اسے دیکھ کر اور کھانا کھلا کر میرے اندر جو ممتا کی پیاس ہوتی اس کو تسکین مل جاتی تھی۔ جس دن وہ نہ آتا' میرا دل تڑپتا رہتا۔ لاکھ اپنے آپ کو سمجھاتی کہ نوراں اب وہ تیرا بیٹا نہیں ہے۔ وہ غلط رستوں پر چل پڑا ہے۔ اب اس کا انجام بھی اچھا نہیں ہو گا' تو اسے بھول جا۔ لیکن میرے اندر موجود ممتا مجھے ایسا نہ کرنے دیتی۔ آخر وہ جیسا بھی تھا میرا بیٹا تھا۔

میرے جگر کا ٹکڑا تھا۔ میں نے بہت سی مصیبتیں جھیل کر اسے پالا تھا۔

پھر اسے بہت دن گزر گئے وہ گھر نہ آیا۔ میں روزانہ شام تک دروازے میں بیٹھی رہتی اور اس کی زندگی کی دعائیں مانگتی رہتی۔ پھر شام کو بستر پر لیٹ جاتی۔ اگلے دن صبح ہوتے ہی دروازے پر آجاتی اور اس کی سلامتی اور واپسی کی دعائیں مانگنا شروع ہو جاتی۔ مگر ماں کے گستاخ اور نافرمان بیٹے کے حق میں کی گئی دعائیں بھی شاید اللہ قبول نہیں کرتا۔

ایک دن دروازے کے آگے سے ایک سپاہی گزرا۔ اس نے پوچھا "ماں' ادھر دروازے پر کس لیے بیٹھی ہے"۔ میں نے بتایا کہ میں اپنے بیٹے کرم الٰہی عرف کرمو بدمعاش کا انتظار کر رہی ہوں۔ تو وہ بولا "اماں تو شاید یہیں انتظار کرتے کرتے مر جائے گی مگر وہ نہیں آئے گا۔ اس نے تو آج سے دو ماہ پہلے ایک سعید نامی لڑکے کو قتل کر دیا تھا اور اب وہ جیل میں اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے"۔

اس روز میرا رو رو کر برا حال ہو گیا۔ اب مجھے اس کے ٹھکانے کا پتا چل چکا ہے۔ میں جب بھی کچھ کھانے لگتی ہوں تو بیٹے کا خیال آجاتا ہے کہ پتا نہیں اس نے کچھ کھایا ہو گا کہ نہیں۔

میں روزانہ گھی لگا کر روٹیاں پکاتی ہوں اور انڈے آملیٹ کرتی ہوں۔ ٹفن میں رکھتی ہوں۔ بیٹی' میرے لیے یہ سفر بڑا تکلیف دہ ہے مگر بیٹے کے لیے دل میں موجود محبت مجھے گھر میں ایک لقمہ بھی حلق سے نیچے نہیں اتارنے دیتی۔ میں وہ چیزیں گھر سے لے آتی ہوں جو میرا بیٹا شوق سے کھاتا تھا' ادھر جیل کے باہر صفائی کرنے والا ایک آدمی میرے پاس آکر اکثر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ مجھے امی جی کہتا ہے۔ میں اسے بیٹا کہ کر بلاتی ہوں اور اپنے پاس بٹھالیتی ہوں۔ خود بھی کھانا کھاتی ہوں اور اس خاکروب کو بھی کھلاتی ہوں اور اپنے بیٹے کا وہ دور یاد کرتی ہوں جب وہ اس خاکروب کی طرح مجھے امی جی کہ کر بلاتا تھا اور میں اس کے وارے نیارے جاتی تھی۔ مجھے جیل کی دیواروں سے اپنے بیٹے کی خوشبو آتی ہے۔ جیل کا عملہ جب بھی ملاقات کا دن ہوتا ہے' کرم الٰہی سے ملنے تو دیتا ہے لیکن اس تک کوئی کھانے پینے کی چیز نہیں پہنچنے دیتا۔ کرم الٰہی اپنے کیے پر بہت پچھتاتا ہے وہ سچے دل سے توبہ کر چکا ہے مگر اسے بہرحال اپنی سزا تو پوری کرنا ہی ہوگی۔ اری! آپ نے مجھے دیر کروا دی۔ میں اب جیل جاتی ہوں"۔

اماں نے ہائے اللہ کہ کر ٹفن پکڑا اور آنسو صاف کر کے لاٹھی کو ٹھک ٹھک زمین پر مارتے ہوئے جیل کی طرف چل پڑیں۔ میں بیٹھی ٹکٹکی باندھے اماں کی طرف دیکھتی رہی۔ مجھے جھنجھوڑ کر مناہل نے کہا "قدرت نے ماں بھی کتنی عظیم چیز بنائی ہے مروہ۔ کرم الٰہی اپنی ماں کا نافرمان بھی تھا اور قاتل بھی ہے۔ لیکن ماں اس سے نفرت کرنے کے بجائے جس جیل میں وہ رہتا ہے اس کی دیوار کے ساتھ لگ کر اپنے اندر کی ممتا کو تسکین پہنچا لیتی ہے"۔

میری دونوں سہیلیاں اسکول کی جانب چل پڑیں۔ مجھے بھی

انہوں نے اسکول کی طرف کھینچا مگران کے اصرار کے باوجود میں اماں کے پیچھے گئی اور کہنے لگی "اماں، اماں ادھر آؤ اب میری بھی ایک بات سنو"۔

اماں نوراں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور رک گئیں پھر کہنے لگیں "بتاؤ کیا بات ہے؟"

"آپ ذرا اس ماں کے بارے میں سوچیں جس ماں کا بیٹا اس دنیا سے صرف اس ایک فقرے کے کہنے کی وجہ سے چلا گیا کہ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے کہ تم کون ہو۔ اماں بشیراں ہماری پڑوسن ہے۔ وہ بھی اس دنیا میں زندہ ہے۔ اپنے بیٹے کے بغیر اس کا بھی تو نوالہ حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ وہ بھی جب کچھ کھانے پینے لگتی ہے تو اسے اپنا جگر گوشہ یاد آجاتا ہے۔

"بیٹا" وہ کرمو کو یہ بات نہ ہی کہتا کہ میں نے تجھے پہچان لیا ہے۔ اس طرح نہ وہ اپنی ماں سے جدا ہوتا اور نہ کرم الٰہی مجھ سے" اماں نوراں نے کہا۔

"اماں، اس نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی تھی" میں نے کہا۔

"بیٹی اس نے بالکل صحیح بات کی تھی۔ میرا ہی بیٹا برا تھا۔ مگر میں کیا کروں۔ میں آخر اس کی ماں ہوں مجھے بھلا اس کے بغیر کیسے سکون آسکتا ہے" اماں نوراں اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں "تم مجھے اس کے پاس لے جاؤ۔ کرمو کی جگہ میں اس دکھی سے معافی مانگ لیتی ہوں۔ اگر اس ماں نے میرے بیٹے کو اپنے بیٹے کا خون معاف کر دیا تو اس کی سزا ختم ہو سکتی ہے اور اگر وہ میرے بیٹے کو نہ بھی معاف کرے تو بھی میں اس دکھی ماں کو ملنا چاہتی ہوں۔ جس کا لخت جگر میرے بیٹے کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو گیا"۔

میں نے کہا "چلو اماں میں آپ کو ساتھ لے کر جاتی ہوں۔ ہو سکتا ہے سعید کی ماں معاف کر دے۔ یوں آپ جیل کے پاس بیٹھنے کے بجائے گھر بیٹھ کر ہی کھانا کھا سکیں، اپنے بیٹے کرم الٰہی کے ساتھ"۔

"آؤ میرے ساتھ میں آپ کو اماں بشیراں کے پاس لے جاتی ہوں"۔

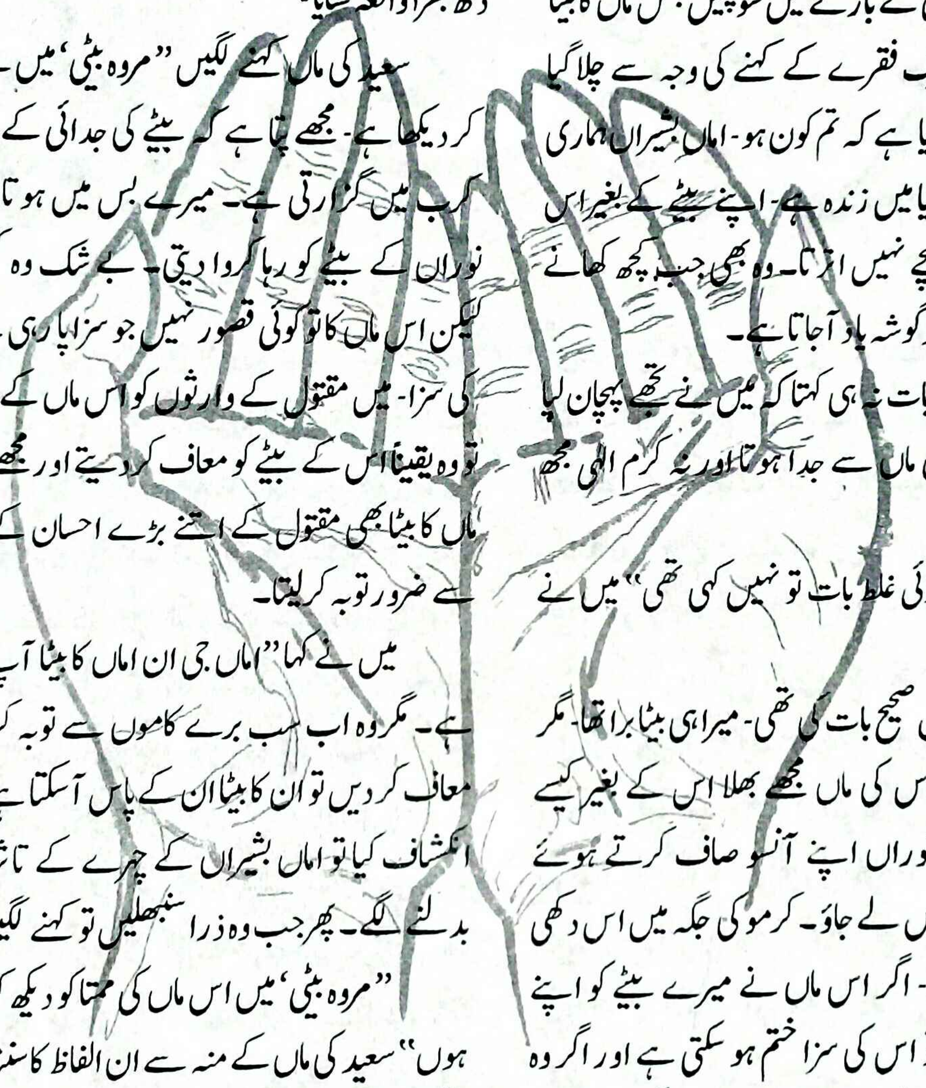

میں نے جا کر سعید کی ماں کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اماں بشیراں نے سعید کی تصویر ہاتھ میں پکڑے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے دروازہ کھولا اور کہا "اندر آجاؤ مروہ بیٹی باہر کیوں کھڑی ہو"۔

میں نے اماں بشیراں کے قریب بیٹھ کر اماں نوراں کا سارا دکھ بھرا واقعہ سنایا۔

سعید کی ماں کہنے لگیں "مروہ بیٹی، میں نے تو یہ دکھ جھیل کر دیکھا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ بیٹے کی جدائی کے لمحے کوئی ماں کس کرب میں گزارتی ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں ضرور اماں نوراں کے بیٹے کو رہا کروا دیتی۔ بے شک وہ کسی کا قاتل ہے۔ لیکن اس ماں کا تو کوئی قصور نہیں جو سزا پا رہی ہے، بیٹے کی جدائی کی سزا۔ میں مقتول کے وارثوں کو اس ماں کے دل کی حالت بتاتی تو وہ یقیناً اس کے بیٹے کو معاف کر دیتے اور مجھے یقین ہے کہ اس ماں کا بیٹا بھی مقتول کے اتنے بڑے احسان کے بعد برے کاموں سے ضرور توبہ کر لیتا۔

میں نے کہا "اماں جی ان اماں کا بیٹا آپ کے سعید کا قاتل ہے۔ مگر وہ اب سب برے کاموں سے توبہ کر چکا ہے۔ اگر آپ معاف کر دیں تو ان کا بیٹا ان کے پاس آسکتا ہے" میں نے جب یہ انکشاف کیا تو اماں بشیراں کے چہرے کے تاثرات جلدی جلدی بدلنے لگے۔ پھر جب وہ ذرا سنبھلیں تو کہنے لگیں۔

"مروہ بیٹی، میں اس ماں کی ممتا کو دیکھ کر ان کو معاف کرتی ہوں" سعید کی ماں کے منہ سے ان الفاظ کا سننا تھا کہ ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔

پھر چند دن بعد ہی اماں نوراں کا بیٹا جیل سے رہا ہو کر گھر آگیا۔ وکیل کے رات دن کے دلائل اور ایک لاکھ کی پیش کش جہاں ناکام ہو گئی تھی وہاں ممتا بازی لے گئی تھی۔ سعید کی ماں کے اندر موجود ممتا اگر جوش میں نہ آتی تو کرمو شاید ساری عمر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی گزار دیتا۔ مگر اب وہ نہ صرف رہا ہو گیا تھا بلکہ اس نے برے کاموں سے توبہ کر لی تھی اور ایک بار پھر ماں کا فرماں بردار بن کر رہنے لگا تھا اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا تھا کہ ایک ماں کی ممتا نے دوسری ماں کی ممتا کو محسوس کر لیا تھا۔

سائنس فکشن / جدید ترین تحقیق

ممتا کا کرشمہ

حسن ذکی کاظمی

پانچ سال کی ننھی کرسٹین اسکول سے آتے ہی پہلا کام یہ کرتی تھی کہ ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے خوب پیار کرتی۔ یہ وہ لمحہ ہوتا تھا جب ڈورس اپنی ساری پریشانیاں بھول جاتی۔ یہاں تک کہ شوہر کی بے وقت موت کا غم بھی کچھ دیر کے لیے اس کے ذہن سے دور چلا جاتا۔ اس وقت تو بس ماں ہوتی تھی اور بیٹی اور ان کے چاروں طرف ممتا کا وہ سمندر جس کی گہرائی آج تک کوئی نہیں ناپ سکا۔ کرسٹین ڈورس کی اکیلی اولاد تھی اور اس کی ساری خوشیوں کا مرکز۔ ڈورس کو ایک منٹ کے لیے بھی یہ بات گوارا نہ تھی کہ وہ کرسٹین کو اکیلا چھوڑے یا کسی اور کے سپرد کرے۔ اس لیے وہ دوپہر کو اسے اسکول سے اپنے دفتر لے جاتی جہاں وہ کھیلتی یا پڑھتی رہتی اور پھر دفتر کے بعد ماں کے ساتھ گھر آتی۔

ایک دن کرسٹین اسکول سے ماں کے نام ایک خط لے کر آئی۔ لکھا تھا کہ کلاس کے بچے اگلے ہفتے شہر سے باہر جانوروں کا فارم دیکھنے جا رہے ہیں۔ کرسٹین بہت خوش تھی اور اس نے یہ ہفتہ بڑے انتظار میں گزارا۔ فارم پر جانے کا دن آیا تو ننھی گڑیا اچھلتی کودتی بڑی خوش خوش اسکول روانہ ہوئی۔ دن گزرا اور شام ہونے لگی تو کرسٹین گھر لوٹی لیکن یہ وہ ہنستی کھیلتی، شریر اور چلبلی کرسٹین نہیں تھی جو صبح اسکول گئی تھی۔ وہ چپ چپ اور کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ آج اس نے ماں کے گلے میں بانہیں بھی نہیں ڈالیں۔ ماں سمجھی کہ تھک گئی ہے۔ لہٰذا اس نے کرسٹین سے کہا کہ وہ کپڑے تبدیل کر کے آرام کرے اور پھر بیٹی کے گالوں کو چوم کے وہ ٹیلی وژن دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔

کرسٹین تھکی نہیں تھی بلکہ وہ ایک خطرناک بیماری میں مبتلا ہو چکی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے چلنا پھرنا چھوڑ دیا، بولنا چھوڑ دیا اور لوگوں کو پہچاننا بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ اور تو اور خود اس کی ماں بھی اب اس کے لیے اجنبی تھی۔ اسے ہسپتال میں داخل کیا گیا جہاں ڈاکٹر اس نتیجہ پر پہنچے کہ کرسٹین پر ای کولائی نامی جراثیم کا حملہ ہوا ہے جو دماغ کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

یہ بیماری کم ہی ہوتی ہے اور اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یہ بیماری ایسی غذا کھانے سے بھی ہو سکتی ہے جس میں خطرناک جراثیم کی آلودگی ہو اور اس کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جانوروں کو چھونے کے بعد بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھا لیا جائے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ کرسٹین نے جانوروں کو چھونے کے بعد ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کھایا ہو گا۔

اس واقعہ سے ڈورس کی زندگی سے ساری خوشیاں ختم ہو گئیں۔ کرسٹین کو معذور ہوئے چھ مہینے گزر گئے تھے۔ وہ ابھی تک ہسپتال ہی میں تھی۔ ڈورس تجارتی معاملات کی

ماہر تھی اور ایک مشہور کمپنی میں بڑے عہدے پر کام کر رہی تھی لیکن کرسٹین کی بیماری کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا سارا وقت اسے دے گی۔ لہٰذا اس نے ملازمت سے استیعفا دے دیا۔ اب اس کا سارا وقت یا تو کرسٹین کے کمرے میں گزرتا یا پھر وہ ای کولائی کے مرض کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہتی۔ اس نے جس قدر معلومات حاصل کیں اتنی ہی اس کی مایوسی بڑھتی رہی۔ ڈاکٹر تھیچر نے اسے بتایا کہ کبھی کبھی اس مرض کا حملہ ہلکا ہوتا ہے اور دماغ کو زیادہ نقصان نہیں پہنچتا لیکن کرسٹین پر حملہ بہت سخت تھا اور اب شاید وہ کبھی بھی صحت یاب نہ ہو سکے۔

کرسٹین کے کمرے میں آج بڑی رونق تھی۔ ڈاکٹر نرسیں اور کرسٹین کی کچھ سہیلیاں جمع تھیں۔ ڈورس نے کرسٹین کو میز کے پاس ایک کرسی پر بٹھا دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کیک کاٹنے میں مدد دی۔ تالیاں بجیں اور کمرے میں سالگرہ مبارک کا شور بلند ہوا۔ تھوڑی دیر میں مہمان چلے گئے اور ڈورس کرسٹین کے پاس اکیلی رہ گئی۔ ڈورس نے بیٹی کی طرف غور سے دیکھا اور اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ اسے کرسٹین کی پچھلی سالگرہ یاد آ گئی۔ بچوں کی بھاگ دوڑ، قہقہے، شور، ہنگامہ۔ اس نے سالگرہ کا تحفہ بچوں کا انسائیکلوپیڈیا دیا تھا جسے اب شاید کرسٹین کبھی نہ پڑھ سکے گی۔ وہ کرسی پر بیٹھی ہوئی کرسٹین کی طرف بڑھی اور اسے سینے سے چمٹا لیا۔ ایسا لگا جیسے ندی کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ ڈورس واقعی چیخیں مار مار کر رونے لگی اور اس نے بے اختیار کرسٹین کو چومنا شروع کر دیا۔ کرسٹین بالکل خاموش تھی اور ماں کو ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جن میں نہ حیرانی تھی، نہ محبت اور نہ خوشی یا رنج۔ آنسوؤں اور سسکیوں کا طوفان تھما تو ڈورس سامنے پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی اور اسے نیند آ گئی۔

ڈورس نے خواب میں دیکھا کہ کرسٹین اس کے گلے میں بانہیں ڈالے اس سے شکایت کر رہی ہے "ممی! آپ نے اس سالگرہ پر مجھے کوئی تحفہ نہیں دیا۔ میں آپ سے ناراض ہوں"۔

ڈورس نے خواب ہی میں یہ محسوس کیا کہ وہ کرسٹین کے بولنے اور اس کے گلے میں بانہیں ڈالنے پر حیران ہو رہی ہے۔ پھر اس نے بیٹی کو خوب پیار کرتے ہوئے کہا۔ "میری گڑیا' ناراض نہ ہو۔ میں نے بہت سوچا کہ تمہیں کیا تحفہ دوں لیکن میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تمہارا تحفہ میرے اوپر قرض ہے۔ اب میں اپنی پیاری گڑیا کو ایسا تحفہ دوں گی کہ اس سے اچھا تحفہ دنیا میں کوئی ہو ہی نہیں سکتا"۔

اور پھر ڈورس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں کہ شاید خواب پھر شروع ہو جائے۔ اسے ابھی تک کرسٹین کے سانس اور جسم کی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ خواب اتنا صاف تھا کہ ڈورس حیران رہ گئی اور زیادہ حیرانی اسے اس وقت ہوئی جب تین چار دن کے بعد اس نے یہی خواب دوبارہ دیکھا۔ وہ سوچنے لگی کہ چوں کہ ہر وقت اس کے دماغ میں کرسٹین کا ہی خیال رہتا ہے شاید اس لیے اس نے دوبارہ یہ خواب دیکھا ہے۔ لیکن جب چند روز کے بعد اس نے تیسری بار یہ خواب دیکھا تو وہ پریشان ہو گئی۔ پھر اسے وہ مضمون یاد آیا جو اس نے ایسے خواب کے بارے میں پڑھا تھا جو بار بار نظر آتے ہیں اور ان کا آئندہ کے حالات سے اکثر بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ وہ خوش ہو گئی اور اسے یقین ہونے لگا کہ کوئی نہ کوئی اچھی بات ضرور ہو گی۔ لیکن پھر خوابوں کا یہ سلسلہ بند ہو گیا اور ڈورس کو جو امید بندھی تھی وہ ناامیدی میں بدل گئی۔ وقت گزرتا رہا۔

ڈورس کو کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ صرف ایک خیال ہر وقت اس کے ذہن پر طاری رہتا تھا اور وہ یہ کہ اگر وہ اپنی زندگی بیچ کر بھی کرسٹین کے لیے صحت اور خوشیاں خرید لے تو یہ سودا مہنگا نہ ہو گا۔ اس نے سوچا اولاد کی خوشی سے زیادہ دنیا میں اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ وہ ہر رات یہ دعا مانگ کر سوتی کہ اسے وہ خواب پھر نظر آ جائے جس میں کرسٹین

کی بانہوں کو اپنے گلے میں جھولتا دیکھ لے۔ لیکن اب تو خواب بھی اس سے اتنی ہی دور جا چکے تھے جتنی کہ حقیقت۔

ایک دن ڈاکٹر تھیچر نے فون پر ڈورس سے کہا "آج میری چھٹی ہے۔ شام کو میرے کمرے میں آجائیں۔ کافی دن سے آپ سے بات بھی نہیں ہوئی۔ چائے بھی پیئں گے اور باتیں بھی ہوں گی۔ نرس کرسٹین کے پاس رہے گی"۔

شام کو ڈاکٹر تھیچر اور ڈورس کی ملاقات بڑی لمبی رہی۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں اور کچھ کرسٹین کے بارے میں۔ جب ڈورس چلنے لگی تو ڈاکٹر نے کہا "ٹھیک ہے اگر آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔ آپ کرسٹین کی فکر نہ کریں۔ اس کی دیکھ بھال ہماری ذمہ داری ہے"۔

دوسرے دن صبح ڈورس کرسٹین کے ماتھے اور گالوں کو چومتی رہی اور دیر تک اپنے آنسوؤں سے اس کا منہ دھوتی رہی۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا "خدا حافظ میری گڑیا۔ تجھے جلد صحت ہو اور تو ہمیشہ خوش رہے" یہ کہ کر وہ جلدی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ ڈاکٹر تھیچر اپنے کمرے میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ وہاں پہنچی تو انہوں نے اسے ایک خط دیتے ہوئے کہا "میری فون پر بات ہو گئی ہے۔ وہ لوگ آپ کا دس بجے انتظار کریں گے۔ لیکن میں ایک بار پھر آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ آپ نے پکا فیصلہ کر لیا ہے؟"

ڈورس نے فوراً ہی جواب دیا "ڈاکٹر میں کرسٹین کی صحت اور اس کے روشن مستقبل کے لیے ہر قیمت ادا کر سکتی ہوں، ہر قربانی دے سکتی ہوں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ ایک ماں کا فیصلہ۔ ہاں لیکن یہ یاد رکھئے گا کہ میں نے کرسٹین کو آپ کے سپرد کیا ہے اور یہ اب آپ کی ذمہ داری ہے کہ ....." ڈورس کی آواز گلے میں رندھ گئی اور آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔

اس واقعہ کو ایک ہفتہ گزرا ہو گا کہ اخبارات میں ملک کے مشہور سرجن ڈون ملٹن کا ایک انٹرویو شائع ہوا جس کی وجہ سے طبی سائنس کے شعبہ میں بہت جوش و خروش پیدا ہو گیا اور ہر شخص بے حد حیران ہوا۔ سرجن ملٹن نے بتایا کہ وہ اور ان کے ساتھی ایک نیا تجربہ کر رہے ہیں۔ وہ صحت مند انسانوں کے دماغ کے خلئے نکال کر انہیں تجربہ گاہ میں بہتر بنائیں گے اور انہیں تعداد میں بڑھائیں گے۔ پھر یہ خلئے ایسے لوگوں کے دماغ میں داخل کئے جائیں گے جو ذہنی معذور ہیں۔ سرجن ملٹن نے خاصی امید ظاہر کی کہ ذہنی معذوروں کے علاج کا یہ طریقہ کامیاب ہو گا۔ یہ تجربہ چوہوں اور بعض دوسرے جانوروں پر کام یاب ہو چکا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ کوشش تو دراصل بیسویں صدی کے آخر

میں شروع ہو گئی تھی لیکن یہ کام اس لیے آگے نہ بڑھ سکا کہ انہیں ایسے رضا کار نہیں مل رہے تھے جن کے دماغ سے خلئے حاصل کئے جائیں۔ لوگ اس لیے اپنے دماغ کے خلئے دینے پر راضی نہیں ہوتے تھے کہ جس کے دماغ سے خلئے لیے جاتے خود اس کے ذہنی معذور بن جانے کا امکان بہت زیادہ تھا۔ سرجن نے کہا کہ کئی سال کی تحقیق اور کوشش کے بعد یہ خطرہ کم تو ہو گیا ہے لیکن ختم نہیں ہوا۔ بہرحال ان کی اپیل پر ایک خاتون اپنی بیٹی کے لئے پہلی بار اپنے دماغی خلیوں کا عطیہ دینے اور یہ خطرہ مول لینے پر راضی ہو گئی ہیں۔ انہوں نے ان خاتون کے اس فیصلے کو ایک عظیم قربانی کا نام دیا اور کہا کہ یہ کام صرف ماں ہی کر سکتی ہے کہ بیٹی کی صحت کی خاطر خود زندگی بھر کے لئے معذور ہونا قبول کر لے۔ یہ قربانی دنیا میں اور کوئی نہیں دے سکتا۔

اس انوکھے تجربے میں ہر شخص کو بے حد دل چسپی تھی۔ اخبار، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر بھی اس کا خوب چرچا تھا۔ کچھ دن بعد خبر آئی کہ ان خاتون کے دماغ سے خلئے حاصل کر لئے گئے ہیں اور تجربہ گاہ میں ان پر ضروری عمل ہو رہا ہے۔ پھر یہ خبر ملی کہ تجربے کا یہ پہلا مرحلہ کامیاب رہا۔ خلئے نکالنے سے ان خاتون کے دماغ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور وہ خیریت سے اپنے گھر جا چکی ہیں۔ تاہم بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ چھ ماہ کی مدت کے دوران میں زیادہ تھکن یا فکر ان کے اعصابی نظام کو بے کار کر سکتی ہے۔

ڈورس کو اپنے ہسپتال سے چھٹی ملی تو وہ سیدھی کرسٹین کے ہسپتال پہنچی اور کمرے میں داخل ہوتے ہی بیٹی کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ نہ جانے کیوں آج اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں بہے۔ کرسٹین کے روشن مستقبل کی امید نے اس کے آنسو خشک کر دیئے تھے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ایک حسین منظر تھا جس میں وہ کرسٹین کو دوڑتے بھاگتے اور قہقہے لگاتے دیکھ رہی تھی۔ یا شاید وہ اس موقعہ پر کوئی بد شگونی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس رات ڈورس سوئی تو اسے بہت دن کے بعد پھر وہی خواب دکھائی دیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ کچھ حیران ہوئی کہ اتنے دن بعد یہ خواب پھر کیوں دکھائی دیا ہے۔ ساتھ ہی خوشی اور سکون کا احساس اس کے دل اور دماغ پر چھا گیا۔

دوسرے دن اسے بتایا گیا کہ وہ کرسٹین سے ملاقات تو کر سکتی ہے لیکن سرجن ملٹن کی ہدایت کے مطابق اسے دوسرے وارڈ میں رہنا ہو گا تاکہ وہ پوری طرح آرام کر سکے۔ اور کرسٹین کو آپریشن کے لئے تیار کیا جا سکے۔ ڈورس سرجن ملٹن کے تجربے کے دوسرے مرحلے کا سخت بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ جب اس کے خلئے کرسٹین کے دماغ میں داخل کئے جائیں گے۔ نہ اسے کبھی یہ خیال آیا کہ اس نے اپنے لئے کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے اور نہ اسے اپنی صحت اور آرام کی فکر تھی۔ وہ تو بس اس خواب کی تعبیر دیکھنا چاہتی تھی جو اسے بار بار نظر آ رہا تھا۔

پھر ڈورس کو بتایا گیا کہ وہ اب کچھ دن تک بیٹی سے نہ مل سکے گی۔ کیوں کہ سرجن ملٹن اب اپنے تجربے کا دوسرا مرحلہ شروع کرنے والے ہیں۔ البتہ اسے کرسٹین کے آپریشن اور حالت کے بارے میں پوری طرح باخبر رکھا جائے گا۔ سرجن نے اسے بہت اطمینان دلایا۔ لیکن وہ اس حالت میں تھی کہ کبھی امید اور کبھی ناامیدی۔ کبھی یقین اور کبھی خوف۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے صبر کا سخت امتحان لیا جا رہا ہے۔ وہ بیٹی جسے وہ ایک لمحہ کے لئے علیحدہ کرنا گوارا نہ کرتی تھی اب نہ جانے کتنے دن اس کی آنکھوں سے اوجھل رہے گی۔ اسے اپنے آرام اور صحت کی تو بالکل فکر نہ تھی لیکن کرسٹین کی خاطر وہ اس امتحان کے لئے بھی تیار ہو گئی۔

کرسٹین کا آپریشن ہو گیا لیکن بڑی خاموشی سے۔ اتنی خاموشی سے کہ اخباری نمائندوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ سرجن ملٹن یہ چاہتے تھے کہ جب تک نتیجہ سامنے نہ آ جائے اس آپریشن کی شہرت نہ ہو۔ سرجن نے ڈورس کو بتایا تھا کہ وہ دو ہفتے بعد بیٹی سے مل سکے گی۔ یہ دو ہفتے ڈورس نے اس طرح گزارے جیسے دو سال۔ نہ اسے نیند

آتی تھی نہ کسی کام کو دل چاہتا تھا۔ دو ہفتے گزر گئے لیکن اسے کرسٹین سے ملاقات کی اجازت نہیں ملی۔ تین ہفتے گزرے اور پھر چوتھا ہفتہ بھی ختم ہونے لگا تو ڈورس کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی۔ اسے انجانے خوف نے گھیر لیا اور اس نے زارو قطار روتے ہوئے سرجن ملٹن سے کہا "سرجن خدا کا واسطہ اب میرا مزید امتحان نہ لیں۔ جس کی خاطر میں نے اپنا مستقبل داؤ پر لگا دیا اگر میں اس سے مل نہ سکوں، اسے دیکھ نہ سکوں تو پھر میری زندگی بے کار ہے۔ اگر کوئی ایسی بات ہے جو آپ مجھے بتاتے ہوئے ڈر رہے ہیں تو میری زندگی بھی ختم کر دیں۔ بس میری یہی التجا ہے۔ سرجن ملٹن اور ڈاکٹر تھیچر اسے تسلی دیتے رہتے لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ خود کافی پریشان ہیں۔ آخر انہیں بتانا ہی پڑا۔ سرجن ملٹن نے ڈورس کو بتایا "دراصل ہمارا یہ تجربہ ابھی پوری طرح کام یاب نہیں ہوا۔ یوں سمجھو کہ پچاس فی صد کام یابی ہوئی ہے"۔

ڈورس نے یہ سنا تو ایسا لگا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ سرجن اس کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئے اور جلدی سے بولے "دیکھو ڈورس یہ بات بھی کچھ کم نہیں کہ کرسٹین بہت جلد پہلے کی طرح چل پھر سکے گی۔ بول بھی لے گی۔ بلکہ بولنے لگی ہے"۔

ڈورس نے چونک کر کہا "تو پھر اس میں اور کیا کمی رہ گئی ہے؟"

سرجن ملٹن نے کچھ نقلی اعتماد کے لہجے میں کہا "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبراؤ نہیں۔ دراصل وہ بات یہ ہے ..... وہ مسئلہ یہ ہے کہ کرسٹین کی یادداشت واپس نہیں آسکی"۔

ڈورس گم سم بیٹھی رہی اور کچھ دیر بعد بولی "وہ بولنے بھی لگی اور چلنے پھرنے کے بھی قابل ہو گئی۔ پھر بھی اسے مجھ سے نہیں ملوایا گیا؟ عجیب بات ہے"۔

سرجن ملٹن نے گردن ہلاتے ہوئے کہا "ہاں ویسے تو یہ عجیب بات لگتی ہے لیکن دراصل کرسٹین مسلسل ماہروں کی نگرانی میں تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ٹسٹ ہو رہے تھے۔ اس وقت اس کا تم سے یا کسی سے بھی ملنا ٹھیک نہ تھا۔ کیوں کہ جراثیم لگنے کا خطرہ تھا"۔

"اور اب؟" ڈورس نے انتہائی بے چینی سے سوال کیا۔

"ہاں اب بہت جلد تم اس سے مل سکو گی۔ بہت جلد" یہ کہ کر سرجن ملٹن نے نرس کو اشارہ کیا اور اس نے چند گولیاں اور پانی کا گلاس ڈورس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے دوا کھائی اور غافل سو گئی۔

ڈورس گہری نیند سے جاگی تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کے کمرے میں کئی لوگ ہیں۔ غنودگی ابھی باقی تھی لیکن اس نے ڈاکٹر تھیچر اور سرجن ملٹن کو پہچان لیا۔ کمرے میں روشنی بھی کم تھی۔ اس نے گردن موڑ کر اپنے سرہانے دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے کرسٹین وہیل چیئر پر بیٹھی ہے اور اسے تک رہی ہے۔ ڈورس نے کئی بار آنکھیں کھولیں اور بند کیں۔ وہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ یہ خواب تو نہیں ہے۔ وہ کچھ دیر آنکھیں بند کئے بے سدھ پڑی رہی پھر اسے اپنے ہاتھ پر کسی کا نرم ہاتھ محسوس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ کرسٹین اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے اسے تکے جا رہی تھی۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر دو ننھی ننھی بانہیں اس کی طرف بڑھیں اور اس کے گلے میں جھول گئیں۔ یہ مامتا کا کرشمہ تھا کہ ماں کے محبت بھرے اور شفیق چہرے کو دیکھ کر اس کی یادداشت واپس آچکی تھی۔

دوسری صبح یہ خبر ہر اخبار کی شہ سرخی تھی اور ساتھ ہی سرجن ملٹن کے یہ جملے بھی چھپے تھے۔ "ڈورس فلپ کہتی ہیں کہ انھوں نے اپنی بیٹی کو اس کی سال گرہ کا تحفہ دیا ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا تحفہ صرف کرسٹین کے لئے نہیں تمام معذور بچوں بل کہ پوری انسانیت کے لئے ہے۔ کیوں کہ انھوں نے اپنے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لے کر لاکھوں بچوں کے علاج کا راستہ کھول دیا ہے اور کرسٹین کا جو علاج، ہم سے نہیں ہو سکا وہ ڈورس کی اپنی اولاد کے لیے محبت نے کر دیا ہے"۔

اشفاق احمد خاں

انوکھی خواہش

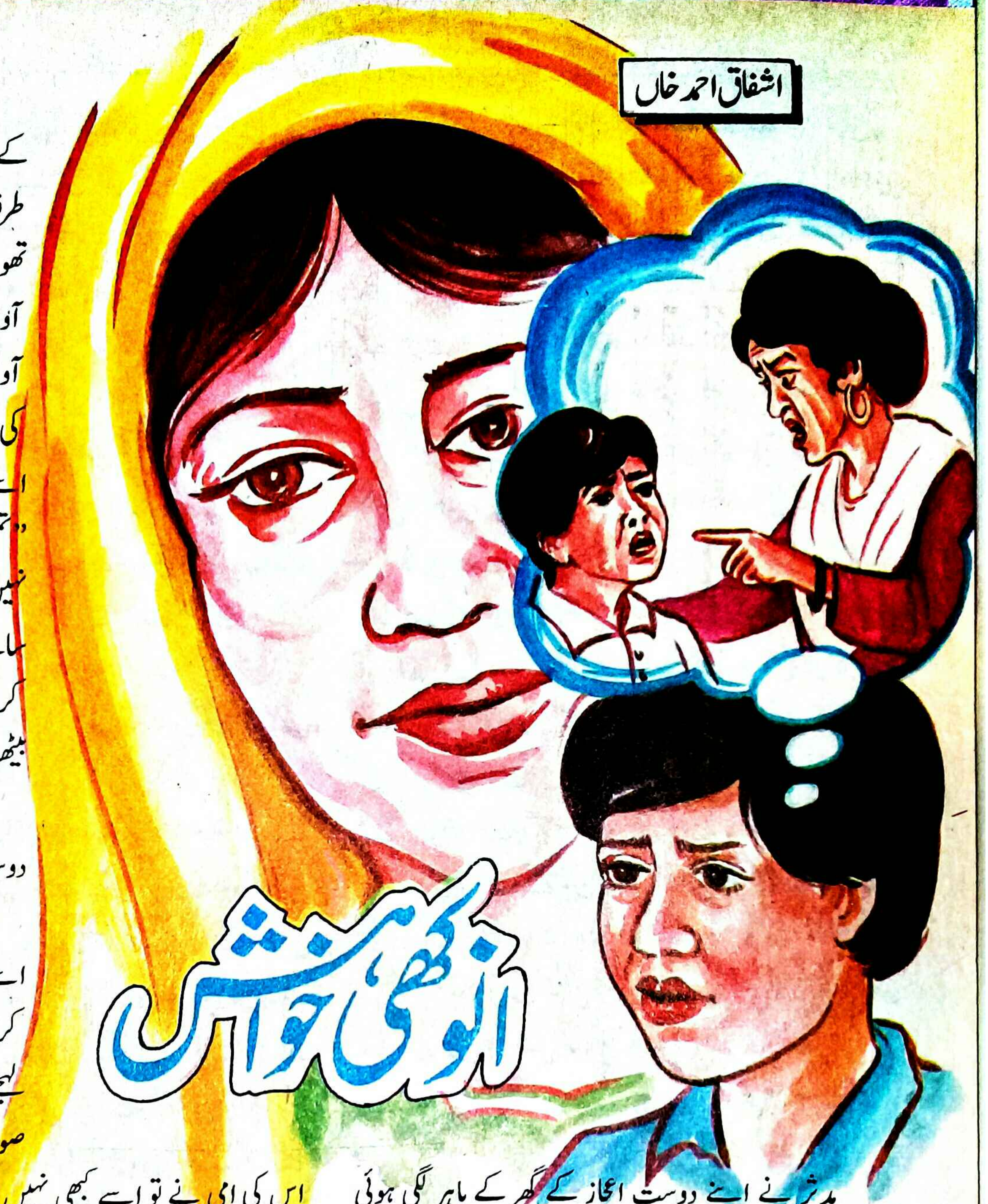

مدثر نے اپنے دوست اعجاز کے گھر کے باہر لگی ہوئی گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد اس کا ہمیشہ کی طرح ہنستا مسکراتا چہرہ دروازے میں نمودار ہوا اور اسے دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا۔

"بہت اچھے وقت پر آئے ہو۔ کرکٹ کا میچ اپنے آخری لمحوں پر ہے۔ بڑا سنسنی خیز مرحلہ ہے۔ آؤ' آؤ' جلدی سے آؤ" اتنا کہ کر اعجاز نے اسے اندر گھسیٹ لیا۔ پھر وہ میچ میں اتنے مگن ہوئے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ وہ تو اس وقت چونکے جب ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے پر دستک ہوئی اور ایک تیز آواز ابھری "اعجاز' ذرا بات تو سنو"۔

"آیا امی جان!" اعجاز یہ کہتا ہوا اندر کی طرف لپکا۔

مدثر' اعجاز کے جانے کے بعد دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اسے سخت آواز میں کسی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ غالباً یہ اعجاز کی امی جان کی آواز تھی۔ وہ اسے ڈانٹ رہی تھیں "تمہیں پڑھائی کا کچھ خیال نہیں' صبح سے ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہو' چلو ٹی وی بند کرو اور کتابیں لے کر بیٹھو"۔

"امی جان' میرا دوست آیا ہوا ہے"۔

"جانتی ہوں میں' اب اسے بھی رخصت کرو' جلدی کرو" اعجاز کی امی نے غصیلے لہجے میں کہا۔ مدثر حیرت سے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی امی نے تو اسے کبھی نہیں ڈانٹا تھا۔

اعجاز کی آواز دوبارہ ابھری "امی جان' وہ ابھی چلا جائے گا"۔

"بحث مت کیا کرو' جاؤ اسے رخصت کر کے پڑھنے کا موڈ بناؤ"۔

"امی جان!" اعجاز کی رندھی ہوئی آواز ابھری۔ کچھ دیر اندر خاموشی رہی پھر اعجاز کی امی کی حیرت بھری آواز ابھری۔ "ارے تمہاری آنکھوں میں آنسو؟ افوہ شاید میں نے تمہیں زیادہ ڈانٹ دیا"۔

مدثر کو بہت حیرت ہوئی۔ اب ان کے لہجے میں شہد جیسی مٹھاس تھی۔ اس کے بعد کی باتوں سے مدثر محسوس کرتا

رہا کہ وہ اب اعجاز سے بہت پیار سے پیش آرہی ہیں۔ یہ بات پہلی مرتبہ اس کے تجربے میں آئی تھی کہ ڈانٹنے کے بعد ماں کے پیار میں اس طرح مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ "میری امی مجھے کیوں نہیں ڈانٹتیں' حال آں کہ میں نے تو انھیں کئی مرتبہ ستایا ہے"۔

اتنی دیر میں اعجاز اندر داخل ہوا۔ اس نے منہ دھو لیا تھا تاکہ رونے کا پتا نہ چل سکے۔ لیکن بھیگی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ابھی یہاں برسات ہوئی ہے۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ مدثر ان کی باتیں سن چکا ہے۔ وہ ٹی وی دیکھنے کے لئے بیٹھا تو مدثر اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا یار' میں اب چلتا ہوں۔ مجھے بہت ضروری کام یاد آگیا ہے"۔

اعجاز نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ اصرار کر کے وہاں سے نکل آیا۔

مدثر اپنے ماں باپ کا لاڈلا اور اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لئے سب ہی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کے ابو کاروبار کے سلسلے میں اکثر ملک سے باہر رہتے تھے۔ اس لئے مدثر کی تمام تر ذمہ داری اس کی امی پر تھی۔ اسے اپنی امی جان بہت پیاری لگتی تھیں۔ لیکن اب اعجاز کے گھر سے آنے کے بعد وہ محسوس کرنے لگا کہ کچھ کمی سی ہے۔ آدمی مسلسل میٹھا کھانا کھائے تو دل چاہتا ہے کہ کوئی نمکین چیز کھانے کو ملے۔ ماں کے میٹھے میٹھے پیار کے ساتھ نمکین سی ڈانٹ بھی کھانے کو ملے تو بڑا مزا آئے۔ مدثر سوچ میں پڑ گیا۔ ایسا کیا طریقہ ہو کہ اس کی امی اسے ڈانٹیں۔ بہت سوچ کر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آگئی۔ چند لمحوں بعد وہ اس تصویر کے سامنے کھڑا تھا جو اس کے امی ابو نے شادی کے بعد کھنچوائی تھی۔ شیشے کے فریم میں لگی وہ تصویر بہت پیاری تھی اور امی جان کو تو زیادہ ہی عزیز تھی۔ تب ہی صفائی کرنے والی ملازمہ کو حکم تھا کہ وہ یہ تصویر خود ہی صاف کیا کریں گی۔ مدثر نے سوچا "یہ تصویر ضائع ہونے سے انھیں بہت دکھ ہو گا۔ وہ اسے ضرور ڈانٹیں گی بلکہ شاید وہ اسے ایک آدھ تھپڑ بھی لگا دیں"۔

مدثر نے تصویر اٹھائی اور بہت زور سے پختہ فرش پر دے ماری۔ چھناکے کی آواز ابھری اور اس کی امی دوڑتی ہوئی آئیں۔ "کیا ہوا؟" آتے ہی ان کے منہ سے یہ فقرہ نکلا۔ پھر ان کی نظر تصویر کے ٹوٹے ہوئے فریم پر پڑی۔ ان کے چہرے پر حیرت اور دکھ کا تاثر ابھرا۔ پھر فوراً ہی وہ تشویش زدہ لہجے میں مدثر کی طرف لپکیں۔ "تم ٹھیک تو ہو بیٹے' کہیں شیشہ تو نہیں لگا"۔ وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر دیکھنے لگیں۔ انھوں نے بالکل نہیں پوچھا کہ تصویر کیسے ٹوٹی۔ مدثر کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔" یہ امی بھی عجیب ہیں .... کہاں یہ کسی کو بھی تصویر کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھیں اور کہاں اب اس کے برے حشر پر مجھے کچھ بھی نہ کہا۔ شاید تصویر سے انہیں پیار اتنا زیادہ نہیں تھا" مدثر نے سوچا۔

"کوئی بات نہیں' مجھے کچھ اور طریقہ سوچنا چاہئے" مدثر نے خود سے کہا۔

چناں چہ اگلے دن وہ اپنا کتابوں کا بستہ گندے نالے میں پھینک آیا۔

"تمہارا بستہ کہاں ہے؟" اس کی امی نے حیرانی سے اس کے خالی کاندھوں کو دیکھ کر پوچھا۔

"وہ .... وہ امی .... وہ تو نالے میں گر گیا"۔

"نالے میں گر گیا" امی جان نے حیرت سے دہرایا۔ "کیسے!" انھوں نے سوال کیا مگر پھر خود ہی بولیں "شاید تم پھسل گئے ہو گے' چلو شکر ہے تم تو بچ گئے۔ بستے کا کیا ہے بستہ اور آجائے گا۔ لیکن دیکھو آئندہ نالے سے دور سے گزرنا" انھوں نے اسے پیار سے سمجھایا۔

"امی جان ..." مدثر جھنجلا گیا "کیا فائدہ ہوا بستہ پھینکنے کا' نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات! شاید امی کو ڈانٹنا ہی نہیں آتا" مدثر نے سوچا "انھیں کسی بہانے سے اعجاز کے گھر لے جانا چاہئے تاکہ یہ سیکھ لیں کہ ڈانٹا کیسے جاتا ہے"۔

اگلے دن اس نے لان کے سارے پودے اکھاڑ ڈالے۔ پورے لان میں پھولوں کے رنگ برنگے پودے اپنی جڑوں سے اکھڑے پڑے تھے۔ اب کے وہ خود بھی مٹی میں

لتھڑا وہیں بیٹھا رہا- بالاخر اس کی امی آ گئیں- پودوں کا حشر دیکھ کر ایک مرتبہ تو ان کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا- مدثر نے دل میں کہا "وہ مارا' یہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے- اب امی کا موڈ آف ہو گا"-

"مدثر!" امی نے قدرے اونچی آواز میں کہا-

مدثر ڈانٹ کھانے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گیا-

"مدثر بیٹے' یہ تمھیں باغبانی کا شوق کب سے ہو گیا؟" اس کی امی جان نے بڑے شرارت بھرے انداز میں اس سے پوچھا تو مدثر کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی- اسے حیرت ہوئی' اتنا خوب صورت لان اس نے برباد کر دیا اور وہ اس کے ساتھ محبت سے پیش آ رہی تھیں-

"تم یہاں کچھ اور پودے لگانا چاہتے ہو؟" اس کی امی بولیں-

"نن .... نہیں امی" مدثر گھبرا گیا- لیکن پھر دل میں آواز ابھری "موقع مت گنواؤ"-

"بس یہ پودے مجھے اچھے نہیں لگے' میں نے اکھاڑ دیئے"-

وہ مسکرا دیں "اب تم بڑے ہو رہے ہو' چیزوں کو پسند اور ناپسند تو کرو گے ہی' چلو تم یہاں اب مالی بابا سے کہ کر اپنی مرضی کے پودے لگوا لینا- لیکن اب تم اندر آجاؤ' کپڑے بدل لو"- اتنا کہ کر وہ اندر چلی گئیں-

مدثر سوچ میں پڑ گیا- اب وہ کیا کرے؟ معاملہ تو کسی طرح بھی نہیں بن پا رہا تھا- اسے ایک لمحے کے لئے اپنی امی بہت بری لگیں- "ڈانٹ کھانا میرا حق ہے- وہ مجھے کیوں اس سے محروم رکھ رہی ہیں"- وہ بڑبڑایا- اسے اپنی اس سوچ پہ حیرت بھی ہوئی کہ وہ اتنا پیار کرنے والی امی کے بارے میں کیا سوچ رہا تھا- لوگ تو پیار کے لئے ترستے ہیں مگر وہ ڈانٹ کھانے کے لئے ترس رہا تھا- لیکن اب اس کے ذہن میں کوئی اور ترکیب نہیں آ رہی تھی- اس لئے اس نے سوچنے کا ارادہ ملتوی کر دیا-

اگلے دن جب وہ اسکول سے واپس آیا تو ذہن میں ایک اور منصوبہ تیار تھا- اس نے آتے ہی لاپروائی سے بستہ ایک طرف پھینکا' بوٹ کا ایک پاؤں ایک کونے میں اور دوسرا دوسرے کونے میں دے مارا' منہ ہاتھ دھوئے بغیر کھانے کی میز پر بیٹھا' ابھی اس کی امی نے کھانا لا کر رکھا ہی تھا کہ وہ پلیٹوں کو پٹخ کر اٹھ گیا اور اپنے کمرے میں جا کر منہ سر لپیٹ کر لیٹ گیا- اس نے اس سارے عمل کے دوران میں اپنی امی کی طرف بالکل نہیں دیکھا تھا- ایسا اس نے جان بوجھ کر کیا تھا- اس نے لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لی تھیں- وہ سوچ رہا تھا کہ آج تو اس نے اپنی امی کا دل زیادہ ہی دکھا دیا ہے- اب وہ اسے ضرور برا بھلا کہیں گی- اب وہ اس انتظار میں تھا کہ وہ اندر آئیں- تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ ابھری- "یہ انھی کے قدموں کی آواز ہے"- اس نے پہچان کر سوچا- اس کی امی اس کے سرہانے بیٹھ گئی تھیں- اور دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں-

"یہ کیا کر رہی ہیں؟" اس نے مایوسی سے سوچا- اچانک اس کے چہرے پر گرم گرم پانی کے قطرے گرے- اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں- اس کی امی کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے- اس کے آنکھیں کھولتے ہی انھوں نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا- "مدثر بیٹے' تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے"-

اس لمحے ان کی آنکھوں کے آنسو دیکھ کر مدثر کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے' یا اس پر آسمان ہی ٹوٹ گرے- ان کی آنکھوں کے آنسو اس کے دل میں گرم سلاخوں کی طرح اترتے چلے جا رہے تھے- اور اس کا دل اس دکھ سے پگھلا جا رہا تھا کہ اس نے اتنا زیادہ پیار کرنے والی ماں کو کتنا ستایا' محض معمولی اور فضول سی خواہش کے لئے' ایسی خواہش جو شاید دنیا کے کسی بھی بچے نے نہ کی ہو گی- اب وہ جان گیا تھا کہ ماں کی محبت لامحدود ہوتی ہے- کوئی اس کا اندازہ نہیں کر سکتا- اور نہ ہی اس کی محبت کی آزمائش کی جا سکتی ہے- بے شک ماں کی مامتا ہر آزمائش میں پوری اترتی ہے-

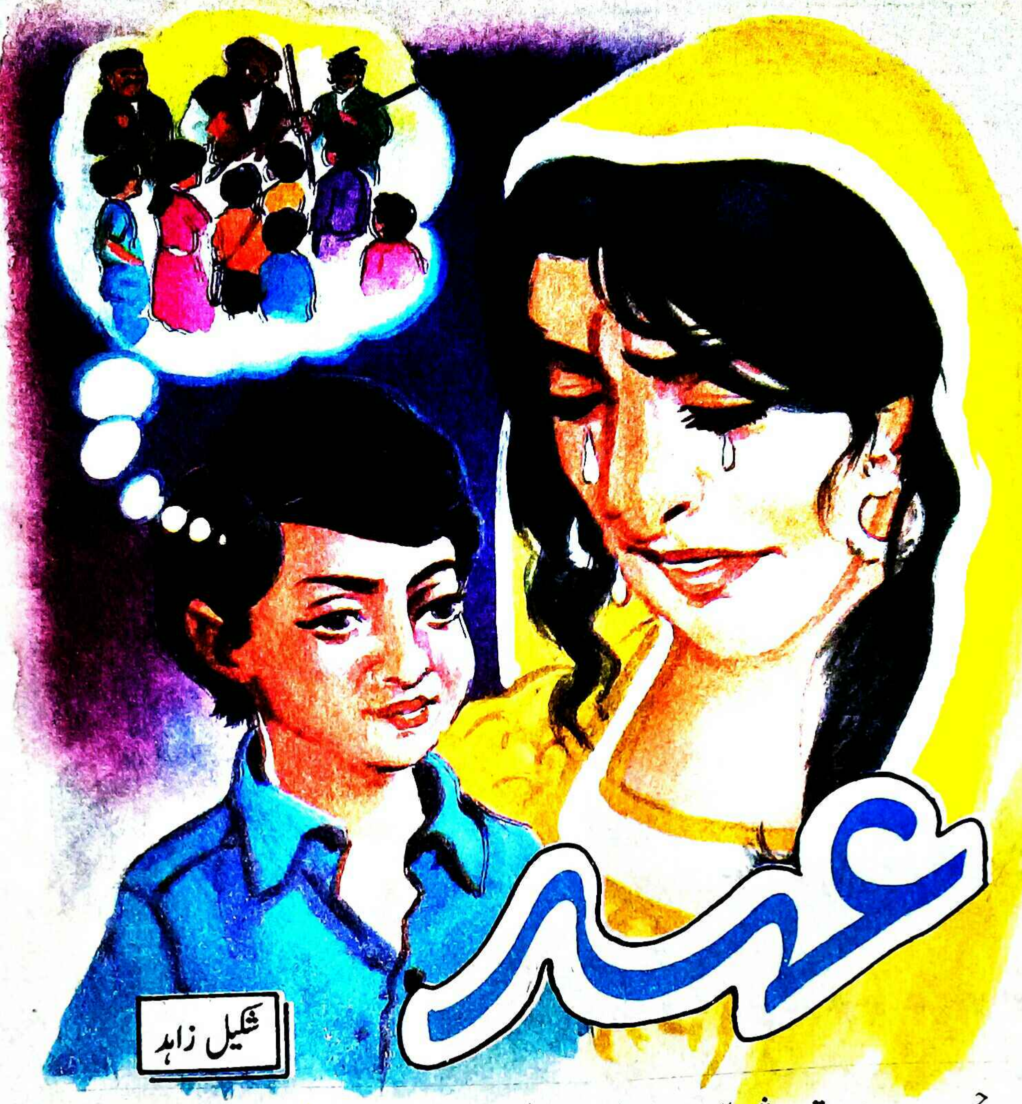

عہد

شکیل زاہد

جس روز یہ واقعہ پیش آیا اس دن کاشف کی دسویں سال گرہ ہوئے پچیس دن ہوئے تھے۔ کاشف اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے والد دوبئی کی ایک کمپنی میں مکینیکل فورمین تھے۔ وہ سال میں ایک بار ایک مہینے کی چھٹی پر آتے تھے۔ یہاں پاکستان میں صرف کاشف اور اس کی والدہ رہتے تھے۔

کاشف ایک خودسر اور ضدی بچہ تھا۔ چوں کہ وہ والدین کی اکلوتی اولاد تھی' اس لیے وہ بھی اسے بہت لاڈ سے رکھتے تھے۔ اس کی والدہ کی کوشش ہوتی کہ اس کی ہر خواہش پوری ہو۔ اسے اچھے اچھے کپڑے پہننے کو دیے جاتے' نئے نئے کھلونوں کا اس کے پاس ایک ڈھیر تھا۔ اس کی امی اسے اکثر سیر کرانے کے لیے لے جاتی تھیں۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ ہر وقت شکایت کرتا رہتا کہ میرے پاس یہ نہیں ہے' وہ نہیں ہے۔ جوں جوں وہ بڑا ہو رہا تھا اپنی امی کی نافرمانی بھی کرنے لگا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کا کوئی کہنا نہ مانے۔ خاص طور پر پڑھنے سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی امی اگر اسے پڑھنے کے لیے اتنا زور دیتی ہیں تو اس میں ضرور ان کا کوئی فائدہ ہے۔

کاشف کی امی اس کی انہی عادتوں کی وجہ سے بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ کاشف کی ہٹ دھرمی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی سالگرہ والے دن بھی یہی ہوا۔ کافی مہمان آگئے تھے۔ کاشف ضد کرنے لگا کہ اب کیک کاٹ دینا چاہیے۔ اس کی امی نے کہا کہ ابھی تمہارے ماموں نہیں آئے۔ انہیں آلینے دو پھر کیک کاٹ لینا۔ اس کی امی نے فون کر کے پتا کیا تھا۔ ماموں اور ان کے بیوی بچے گھر سے چل پڑے تھے۔ وہ سب آنے ہی والے تھے۔ کاشف کے دوست امجد نے بھی اسے سمجھایا کہ امی جو کہ رہی ہیں وہ مان لو' مگر اس نے ایک نہ سنی اور کیک کاٹ دیا۔ ابھی تالیاں بج ہی رہی تھیں کہ ماموں اور ان کے گھر والے آگئے۔ امی کو بہت شرمندگی ہوئی مگر کاشف کو ان کی شرمندگی کی ذرا پروا نہیں تھی۔ اس رات کاشف کی امی دیر تک بستر پر لیٹی روتی رہیں۔ کاشف نے ان کے رونے کی آواز سن لی تھی۔ کیوں کہ وہ ان کے ساتھ ہی سوتا تھا' لیکن اس نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی امی یونہی خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ یہ بات

ہرگز اتنی بڑی نہیں ہے کہ اس پر یوں رویا جائے۔

پھر وہ واقعہ پیش آیا۔ جو میں آج آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔

کاشف جس اسکول میں پڑھتا تھا وہ اس کے گھر سے 10 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس کی امی اسے صبح اسکول چھوڑنے کے لیے جاتیں اور چھٹی کے وقت لینے آتیں۔ ان کے پاس اپنی سوزوکی کار تھی۔ اتنا لمبا سفر دو بار کر کے وہ کافی تھک جاتی تھیں، لیکن گھر آکر وہ اسی طرح کام میں لگی رہتیں۔ ان کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ کاشف کو ہر طرح کا آرام اور سہولت ملے۔ اسی روز چھٹی کے وقت اسکول جاتے ہوئے ان کی کار کے دو ٹائر اکٹھے پنکچر ہو گئے۔ ایک ٹائر تو انہوں نے بدل لیا لیکن دوسرے کا پنکچر لگوانا ضروری تھا۔ انہوں نے خود ہی ٹائر کھولا اور اسے اٹھا کر ایک طرف چل پڑیں۔ تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر چوک تھا جہاں سے انہیں امید تھی کہ پنکچر لگانے والے کا پتا چل جائے گا۔ انہیں پریشانی ہو رہی تھی کہ چھٹی کا وقت ہونے والا ہے اور انہیں دیر ہو رہی ہے۔ اس راستے پر ٹریفک بہت کم ہوتی تھی۔ وہ پیدل چلتی ہوئی چوک تک پہنچیں۔ انہیں پتا چلا کہ پنکچر لگانے والے کی دکان وہاں سے دو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ دو کلو میٹر پیدل چلنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ وہیں کھڑی ہو کر کسی سواری کا انتظار کرنے لگیں۔ 15 منٹ بعد انہیں ایک رکشا ملا۔ وہ اس میں بیٹھیں اور پنکچر لگانے والے کی تلاش میں چل پڑیں۔

پنکچر لگوانے کے بعد وہ اسی رکشے میں واپس اپنی کار تک گئیں۔ انہوں نے دوسرا ٹائر لگایا اور اسکول کی جانب روانہ ہو گئیں۔ جب وہ اسکول پہنچیں تو وہاں ہو کا عالم تھا۔ تمام بچے جا چکے تھے۔ گیٹ بند ہو گیا تھا۔ ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ انہوں نے کاشف کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ چاہے کتنی ہی دیر ہو جائے وہ اکیلا گھر آنے کی کوشش کبھی نہ کرے۔ لیکن لگتا تھا کہ کاشف نے ان کی بات نہیں مانی۔ وہ وہاں موجود نہیں تھا۔

چند لمحوں تک تو اس کی امی کو سمجھ ہی نہ آئی کہ وہ کیا کریں۔ وہ گھبرا کر کبھی ادھر جاتیں کبھی ادھر۔ ان کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ عجیب و غریب خیالات ان کے ذہن میں چکرا رہے تھے۔ انہوں نے ان خیالات کو جھٹکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بہرحال ایک ماں تھیں۔ اسکول کا گیٹ کھٹ کھٹایا تو تھوڑی دیر بعد ایک چوکی دار نکلا۔ "بھائی صاحب، کوئی بچہ اندر تو نہیں ہے؟" انہوں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"اندر؟ نہیں بی بی جی.... سب بچہ لوگ چلا گیا ہے"۔

"آپ ایک بار پھر دیکھ لیں شاید میرا بیٹا اندر ہی ہو، مجھے آج آنے میں دیر ہو گئی، میرا بیٹا اندر ہی ہو گا"۔

"اندر کوئی نہیں ہے بی بی جی" چوکی دار نے کہا۔

"آپ دیکھیں تو سہی"۔

"اچھا، ٹھیک ہے" چوکیدار مشکل سے راضی ہوا۔

وہ پلٹا اور گیٹ کھلا چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ اگلے دس منٹ کاشف کی امی کے لیے دس دنوں کے برابر تھے۔ وہ اللہ سے گڑ گڑا کر دعا مانگ رہی تھیں کہ ان کا بیٹا مل جائے۔ لیکن دس منٹ بعد چوکیدار اکیلا ہی واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ اسکول میں کوئی بچہ نہیں ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کاشف کی امی رو پڑیں۔ ان کے آنسو دیکھ کر چوکیدار کا دل بھی پسیج گیا۔ "بی بی جی، گھر جاؤ، خود ہی آجائے گا۔ کتنا بڑا بچہ ہے؟"

"دس سال کا"۔

چوکیدار جانتا تھا کہ دس سال کے بچے کے لیے اکیلے سفر کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ لیکن وہ بھی کیا کر سکتا تھا۔ وہ چپ ہو گیا۔ کاشف کی امی پلٹیں اور بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے کار تک پہنچیں۔ وہ کافی دیر کار میں گم سم بیٹھی رہیں پھر انہوں نے کار اسٹارٹ کی اور گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔ گھر پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ کاشف ابھی تک نہیں پہنچا۔ وہ وہیں دروازے کے پاس بیٹھ گئیں۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ اگر کاشف تھوڑی دیر اور نہ آیا تو پولیس میں

رپورٹ درج کرا دیں۔ پھر ان کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکلے اور ان کے گالوں پر بہنے لگے۔

کاشف نے چھٹی ہونے کے بعد صرف 15 منٹ تک اپنی امی کا انتظار کیا۔ اس کی امی چھٹی ہونے سے پہلے ہی اسکول کے گیٹ پر پہنچ جایا کرتی تھیں۔ آج جب وہ نہیں آئیں تو کاشف سمجھا کہ وہ کسی مصروفیت کی وجہ سے آنا بھول گئی ہیں۔ اسے یاد تھا کہ ان کی امی نے سختی سے تاکید کی ہوئی تھی کہ کچھ ہو جائے اس نے ان کا اسکول کے اندر ہی انتظار کرنا ہے۔ لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ اب کافی دیر ہو چکی ہے اور امی اب نہیں آئیں گی۔ چناں چہ اس نے اپنا بستہ سنبھالا اور اسکول سے روانہ ہو گیا۔

اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ گھر کیسے جایا جائے۔ اس نے سنا تھا کہ اسکول کے پاس سے کوئی بس اس کے گھر کی طرف جاتی ہے۔ نویں جماعت کے دو لڑکے جو اس کے محلے میں ہی رہتے تھے، ایک بس پر اسکول آیا جایا کرتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ بس اسٹاپ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

بس بہت بھری ہوئی آئی۔ اس پر چڑھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس نے اسے گزر جانے دیا۔ پھر دوسری اور تیسری بھی بہت بھری ہوئی آئیں۔ وہ ہمت کر کے تیسری میں سوار ہو گیا۔ ابھی اسے یہ بات نہیں معلوم تھی کہ ہر بس کے روٹ کا ایک نمبر ہوتا ہے اور بس صرف اپنے روٹ پر ہی چلتی ہے۔ اسے سیٹ تو نہیں ملی البتہ ایک جگہ بڑی مشکل سے کھڑے ہونے کی جگہ مل گئی۔ اسے باہر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیوں کہ کھڑکی کے سامنے بھی دو آدمی کھڑے تھے۔ اسے بار بار دھکے پڑتے تھے۔ اسے بار بار خیال آ رہا تھا کہ بس میں سوار ہو کر اس نے غلطی کی ہے۔ یہاں تو بہت ہی بری حالت ہے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد کنڈکٹر اس کے پاس آیا "چلو بھئی پیسے نکالو"۔

کاشف نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور واحد ایک روپے کا نوٹ کنڈکٹر کے حوالے کر دیا۔

"کہاں جانا ہے؟"

کاشف نے اپنے محلے کا نام بتایا۔

"لیکن یہ بس تو وہاں نہیں جاتی"۔

کاشف دھک سے رہ گیا "کیا؟ تو پھر یہ کہاں جاتی ہے؟"

"اگر تم نے اپنے علاقے میں جانا ہے تو آٹھ نمبر کی بس میں بیٹھو یہ تو گیارہ نمبر ہے" کنڈکٹر نے کہا۔

"اچھا تو پھر مجھے اتار دیں"۔

"ابھی اسٹاپ آئے گا تو اتر جانا"۔

بس تھوڑی دیر بعد رک گئی۔ کاشف لوگوں کو دھکیلتا ہوا نیچے اترا۔ اس کے چہرے پر دو جگہ رگڑ لگ جانے سے جلن ہونے لگی تھی۔ وہ نیچے اترا تو اس کی قمیص پتلون سے باہر آ چکی تھی۔ بیگ بھی کاندھے سے اتر کر بازو پر جھول رہا تھا۔ اس کے علاوہ بس سے چار آدمی اور اترے۔ کاشف وہیں اسٹاپ پر پریشان کھڑا ہوا تھا۔ بس سے اترنے والا ایک بوڑھا سا شخص اس کے پاس آیا۔ "کیا بات ہے بیٹا، تم بہت پریشان لگ رہے ہو" بوڑھے نے پوچھا۔ کاشف رو پڑا۔

"ارے، ارے تمہیں کیا ہوا؟" بوڑھے نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"میں غلط بس میں بیٹھ گیا۔ اپنے گھر جانا تھا، کہیں اور چلا آیا۔ نہ جانے یہ کون سی جگہ ہے؟"

یہ جگہ کاشف نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ وہ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ دور دور تک ویران اور سنسان سڑک تھی۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنی امی کا کہنا نہ مان کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ "اب میں ہمیشہ اپنی امی کا کہنا مانا کروں گا" اس نے کہا اور دعا مانگی "اے اللہ مجھے گھر پہنچا دے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی امی کی نافرمانی نہیں کروں گا"۔

"تمہیں اپنے گھر کا پتا معلوم ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"ہاں جی، بالکل معلوم ہے"۔

"تو آؤ، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں"۔

"ٹھیک ہے" کاشف خوش ہو گیا۔ اس نے جلدی جلدی گالوں پر بہنے والے آنسو پونچھے۔

بوڑھے شخص نے ایک رکشے کو روکا اور کاشف کو لے کر اس میں بیٹھ گیا۔ بیس منٹ تک رکشا چلتا رہا پھر رک گیا۔ کاشف نے دیکھا کہ یہ کوئی اور جگہ تھی اس کا محلّہ نہیں تھا۔ "یہ تو ہمارا علاقہ نہیں ہے"۔

"جانتا ہوں" بوڑھے نے اترتے ہوئے کہا "یہاں مجھے ایک صاحب کو ایک چیز دینی ہے" اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے تھیلے کی طرف اشارہ کیا "یہ دے کر ابھی فارغ ہو جاؤں گا پھر چلیں گے"۔

کاشف کا دل پھر رونے کو چاہنے لگا۔ "مجھے جلدی گھر لے چلیں، مجھے امی یاد آرہی ہیں"۔

"ابھی چلتے ہیں، ابھی چلتے ہیں" بوڑھے نے کاشف کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف چل پڑا۔ اس علاقے میں تنگ تنگ گلیاں تھیں۔ وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ آخری مکان کے سامنے جا کر وہ رکا اور اس نے گھنٹی بجائی۔ ایک لمبے تڑنگے شخص نے دروازہ کھولا۔ بوڑھا کاشف کو لے کر اندر داخل ہوا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

لمبے تڑنگے شخص نے کاشف کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور ایک طرف گھسیٹنے لگا۔

"مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" کاشف چلایا "مجھے اپنی امی کے پاس جانا ہے"۔

"چپ کر بدبخت" بوڑھا غرایا۔ اس کی ساری شفقت ختم ہو گئی تھی "اب یہاں رہے گا تو۔ بھول جا امی کو' زیادہ شور مچایا تو زبان کاٹ دوں گا"۔

کاشف سہم کر چپ ہو گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔ اس نے سنا تھا کہ اغوا کرنے والے بچوں کو بھکاری بنا دیتے ہیں۔ وہ پھر رونے لگا۔

اگلے دو دن کاشف نے روتے ہوئے ہی گزارے۔ اسے ایک چھوٹے سے اندھیرے کمرے میں رکھا گیا تھا۔ یہاں اس کے علاوہ دو لڑکے اور تھے۔ انہیں بھی بوڑھے نے بہلا پھسلا کر اغوا کیا تھا۔ کاشف کو اپنی امی ہر وقت یاد آتی تھیں۔ اسے یاد آتا کہ وہ اس کا کتنا خیال رکھا کرتی تھیں۔ کتنی اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دیا کرتی تھیں۔ یہاں دو دن سے وہ مسلسل دال روٹی کھا رہا تھا۔ دال میں بے تحاشہ کنکر ہوتے تھے۔ اس سے کھائی بھی نہیں جاتی تھی۔ "یا اللہ مجھے معاف کر دے' یا اللہ مجھے معاف کر دے" وہ ہر وقت یہی دعا مانگتا رہتا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ جتنا خیال اس کی امی اس کا رکھتی ہیں' اور جتنی محبت وہ اس سے کرتی ہیں' کوئی نہیں کرتا۔

تیسرے دن انہیں باہر نکالا گیا۔ رات کا وقت تھا۔ تینوں لڑکے' بوڑھا اور وہ لمبا تڑنگا شخص اندھیری گلی میں سے نکلے اور ایک کار میں بیٹھ گئے۔ کار روانہ ہو گئی۔ کافی دیر چلنے کے بعد کاشف کو پتا چلا کہ وہ شہر سے باہر جا رہے ہیں۔ کار دریا کے پل پر پہنچ گئی تھی۔ پل پر کاروں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی۔ ان کی کار بھی رک گئی۔

اچانک سائرن بجنے کی آواز آئی۔ بوڑھے اور لمبے تڑنگے شخص کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ فوراً ہی پولیس کی دو جیپیں ان کی کار کے پاس آئیں اور پولیس والوں نے ان کی کار کو گھیرے میں لے لیا۔ بوڑھے' لمبے تڑنگے شخص اور ڈرائیور کو گرفتار کر لیا گیا۔ بچوں کو تھانے پہنچا دیا گیا۔ انسپکٹر نے بتایا کہ ان لوگوں پر اسے بہت عرصے سے شک تھا۔ وہ انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا۔ پھر ان بچوں کی گمشدگی کی رپورٹ بھی مختلف تھانوں میں لکھوائی جا چکی تھی۔ وہ چوکنا تھا۔ جونہی وہ لوگ بچوں کو لے کر نکلے اس نے ان کا پیچھا کیا اور یہاں آلیا۔

کاشف کی امی کو فون پر کاشف کے ملنے کی اطلاع دے دی گئی۔ وہ بھاگی بھاگی آئیں اور کاشف کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئیں۔ وہ اسے بے تحاشا پیار کر رہی تھیں اور روتی جا رہی تھیں۔ کاشف بھی رو رہا تھا۔ اس نے عہد کر لیا تھا کہ آئندہ اپنی امی کا ہر حکم مانے گا کیوں کہ اس میں اسی کی بہتری تھی۔

ڈاکٹر رضوان ثاقب

ایک قابلِ تقلید ماں

"فرزندان اسلام میرے عزیزو' آج جب کہ تمہاری مجلس میں پہلی دفعہ اور شاید آخری دفعہ آئی ہوں۔ آخری دفعہ اس لیے کہ اب عمر کی آخری منزل آگئی ہے۔ آپ نے جس محبت اور جوش کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا اس کا اجر سوائے خدا کے اور کوئی نہیں دے سکتا۔ لیکن آپ نے اپنی محبت کا نقش میرے دل پر بٹھا دیا جو انشاء اللہ تادم مرگ میرے دل سے محو نہ ہوگا۔ خدا کرے آپ کا یہ جوش ہمیشہ قائم رہے اور اسلام کی خدمت میں صرف ہو۔

بیوگی اور مصیبت کے 45 سال میں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کاٹ دیئے اور اس آخری وقت میں جب کہ قبر میں جانے کا وقت ہے نہ کہ گھر سے باہر نکل کھڑے ہونے کا' میں یہاں تمہارے روبرو آموجود ہوئی ہوں۔ تاریخ میں آج کا واقعہ ایک یادگار واقعہ ہوگا۔ اس لیے نہیں کہ ایک ضعیف العمر عورت غریب الوطنی کی چادر اوڑھ کر آپ کے پاس آئی ہے' نہ اس لیے کہ چھنڈ واڑہ کی کوٹھی سے نکل کر میں آپ کے پاس کوئی فریاد لے کر آئی ہوں۔ اگر میں محض اپنے بچوں کی خیریت کی طلب گار ہو کر آئی ہوتی یا حکومت کے مظالم کی فریاد لے کر آتی یا ان مصیبتوں کی داستان سناتی جو ہر سچے مسلمان کو امتحاناً جھیلنا پڑتی ہیں' تو یقین جانو تمہارے دل غم سے بھر آتے۔ مگر میں ان اغراض کے لیے تمہارے پاس نہیں آئی بلکہ صرف ایک پیغام لے کر آئی ہوں اور یہ پیغام نہ میری ذات سے وابستہ ہے اور نہ اسلام کے ان دو خادموں کی ذات سے جن کو خدا نے امانتاً میرے سپرد کیا ہے اور جنہوں نے میری گود میں پرورش پائی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ایک ضعیف العمر ماں کا دل اپنے جواں ہمت بچوں کی محبت سے لبریز ہونا چاہیے۔ میں بھی انسان ہوں اور میرا دل بھی اس محبت سے ناآشنا نہیں۔ لیکن میرے عزیزو' یاد رکھو کہ تم سب اپنے ماں باپ کے فرزند ہو۔ ماں باپ سے جو تمہارا قدرتی رشتہ ہے اس رشتے سے زیادہ مضبوط ایک اور تعلق بھی ہے جس کو تم بھول تو سکتے ہو مگر قطع نہیں کر سکتے۔ وہ رشتہ' وہ تعلق ایک ایسا جادو ہے جو مجھے گوشہ عافیت سے نکال کر کلکتہ لے آیا۔ اس جادو کا نام اسلام ہے اور وہ منتر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔

"میرے بچو' اگرچہ تم بھی ماں کی محبت بھری گود میں پلے ہو مگر یاد رکھو کہ تم سب سب سے پہلے اسلام کے فرزند ہو۔ دنیا کے تمام رشتے ایک سانس کے ساتھ ٹوٹ جاتے ہیں مگر مذہب کا رشتہ تمہارے توڑے نہیں ٹوٹ سکتا۔

"فرزندان اسلام' جس وقت میرے بچوں کی آزادی کے متعلق شملہ پر مشورے ہو رہے تھے اور خفیہ کا افسر میرے بیٹوں کے پاس کچھ شرائط لے کر آیا تھا' وہ وقت میرے بیٹوں کے لیے ایک سخت امتحان کا وقت تھا۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ خفیہ کا انسپکٹر ان سے ایک تحریری وعدہ مانگ رہا ہے تو تم نے سنا ہوگا کہ میں کس طرح وہاں گئی اور میں نے اس سے اور اپنے بیٹوں سے کیا کہا۔

میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرا پیام حکومت تک پہنچا دے کہ اگرچہ اس سن رسیدہ عورت کا جسم اب کمزور ہو گیا ہے لیکن دل اور دل کے اندر ایمان اتنا کمزور نہیں کہ اپنے بیٹوں کو وہ حق کی راہ سے ایک قدم باہر جانے کی اجازت دے۔ اگر میرے بیٹے آزادی حاصل کرنے کی کوئی ایسی شرط قبول کریں گے جو اسلام کی شان کے خلاف ہوگی اور ملک کے مفاد کے منافی ہو گی تو باوجود اپنی اس تمام محبت کے جو مجھے اپنے بیٹوں سے ہے میں انشاء اللہ اپنے ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دوں گی۔

تم جانتے ہو کہ میں نے دو سال خاموشی کے ساتھ اس طرح گزار دیئے کہ گویا میں خود بھی اپنے بیٹوں کے ساتھ نظر بند ہوں' لیکن اب تم پوچھو کہ اس دو سال کی خاموشی کے بعد مجھے کون سی چیز کھینچ کر یہاں لائی؟ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ جس وقت تک میرے

بیٹوں کی آزادی کا مسئلہ زیر بحث نہ آیا' میں خدا پر بھروسہ کیے صبرو شکر کے ساتھ بیٹھی رہی اور شاید اسی طرح بیٹھی رہتی۔ اس لیے کہ ظلم اور مصیبتیں میرے لیے خوف ناک چیزیں نہیں ہیں۔ حکومت کے خود غرض اور انتقام پسند حکمرانوں نے جب دیکھا کہ میرے بیٹوں کی آزادی کا مسئلہ زیر غور ہے تو ان پر ایک ایسا الزام لگایا گیا جس کا جواب دینا ان پر فرض ہو گیا اور ان سے زیادہ مجھ پر۔ وہ الزام یہ تھا کہ میرے بچے ترکوں سے ہمدردی ظاہر کرتے ہیں۔

اے فرزندان اسلام' آج میں تمہارے سامنے کہتی ہوں کہ یہ الزام اسلام کی ایک ایسی توہین ہے جس کو کوئی سچا مسلمان برداشت نہیں کر سکتا اور جس کا جواب دینا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ کیا اسلامی اخوت کے رشتے کو کسی حکومت کے بے معنی شبہات اور جابرانہ احکام کاٹ سکتے ہیں؟ کیا غیرت مذہبی کی اس عمارت کو جس نے تیرہ سو برس تک زمانے کے بہت سے طوفان دیکھے ہوں حاکموں کی ناراضگی اور خفگی صدمہ پہنچا سکتی ہے؟

اے مسلمانو' آج میں تم سے اپنے اس سوال کا جواب مانگتی ہوں! کیا "کل مسلم اخوۃ" کے کوئی معنی نہیں؟ کون ہے جس کے دل میں اپنے مسلمان بھائیوں سے خواہ وہ عرب میں ہوں یا عجم میں' ترکی میں ہوں یا مراکش میں' افریقہ کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں ہوں یا شام کے سبزہ زاروں میں' ہمدردی نہیں؟ اگر حکومت کے نزدیک یہ ہمدردی بغاوت ہے تو صرف میرے بیٹے ہی باغی نہیں ہندوستان کے 8 کروڑ مسلمان باغی ہیں اور اگر حکومت نے اس عذر کو اپنے طرز عمل کے لیے استعمال نہ کیا ہوتا تو شاید میں اب بھی باہر نہ نکلتی مگر جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں اب سوال میرا تمہارا نہیں سوال اسلام کا ہے۔ اس وقت تم کو اور تمہارے مذہب کو ایک سخت امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ خدا تمہیں توفیق دے کہ تم اس سے کامیاب اور سرخرو نکلو۔

آخر میں پھر اپنے عزیزوں سے التجا کرتی ہوں کہ سوائے خدا کے کسی طاقت سے مرعوب نہ ہوں اور اپنے ایمان پر بھروسہ کر کے یقین رکھیں کہ اگر وہ ثابت قدم رہے تو فتح ان کی ہے"۔

یقیناً آپ جان چکے ہوں گے یہ فرزندان اسلام کے نام پیغام کس کا ہے۔ یہ پیغام ملکہ حریت' ام الاحرار' تحریک آزادی کے عظیم مجاہد مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی والدہ مکرمہ کا ہے جنہیں پوری قوم بی اماں کے نام سے جانتی ہے۔ یہ پیغام انہوں نے فرزندان اسلام کو 30 دسمبر 1917ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (کلکتہ) میں دیا۔

بی اماں کا شمار تاریخ کی ان چند معزز ہستیوں میں ہوتا ہے جن کی گود کی تربیت نے انہیں تاریخ ساز شخصیت بنا دیا۔ محمد علی اور شوکت علی ایسے ہی دو تاریخ ساز نام ہیں جن کی پہلی درس گاہ بی اماں کی گود تھی۔ مولانا محمد علی فرماتے ہیں "میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے مجھے میری والدہ مرحومہ کے ذریعے سے پہنچایا ہے"۔

بی اماں کا اصل نام آبادی بانو تھا اور امروہہ ضلع مراد آباد کی رہنے والی تھیں۔ آپ 1852ء میں پیدا ہوئیں۔ ابھی 27 سال کی تھیں کہ آپ کے خاوند کا انتقال ہو گیا۔ رشتہ داروں نے جب دوسری شادی پر زور دیا تو انہوں نے کہا "خبردار جو کبھی کسی نے ایسی بات منہ سے نکالی۔ یہ میرے چھ لخت جگر مجھے کیا کم ہیں۔ میری عمر کی

خدمت اور جاں نثاری کے لئے یہ کافی ہیں۔

انہوں نے پردے میں رہنے کے باوجود اپنے بچوں کی تربیت کی اور انہیں اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔ بلاشبہ وہ بڑی جرات مند خاتون تھیں۔ مولانا محمد علی اکثر کہا کرتے تھے "میری امی اگرچہ ان پڑھ تھیں مگر مجھے جن لوگوں کا زندگی میں تجربہ ہے ان میں سے کسی ایسے شخص سے مجھے سابقہ نہیں پڑا جسے میں اپنی والدہ سے زیادہ عقل مند اور ان سے بڑھ کر خدا پرست اور روحانی کہ سکوں"۔

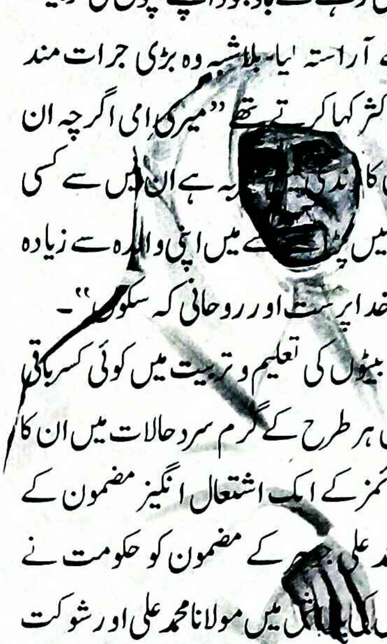

بی اماں نے بھی اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی اور اپنی زندگی میں ہر طرح کے گرم سرد حالات میں ان کا پورا پورا ساتھ دیا۔ لندن ٹائمز کے ایک اشتعال انگیز مضمون کے جواب میں لکھے گئے مولانا محمد علی جوہر کے مضمون کو حکومت نے قابل اعتراض قرار دیا اور اس کی پاداش میں مولانا محمد علی اور شوکت علی کو چھنڈواڑہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ مجاہد بیٹوں کی قابل فخر ماں اپنے بیٹوں کے قریب رہنے کے لئے چھنڈواڑہ میں قیام پذیر ہو گئیں۔

اپنے بیٹوں کی نظر بندی پر فخر کرتے ہوئے بی اماں نے کہا "یہ عزت صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جن کو خدا اپنے اور اپنے دین کی خاطر تکلیفیں برداشت کرنے کے لیے منتخب کرتا ہے"۔

جب لوگوں نے کہا کہ وہ اپنے بیٹوں کے لیے رحم کی اپیل کریں تو انہوں نے کہا "مجھے اپنے لیے اور نہ اپنے بچوں کے لیے ان سے کچھ مانگنا ہے۔ میرے لیے خدا کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے اور دن و رات میں میں کم از کم پانچ سات بار اس چوکھٹ پر سر جھکاتی اور ہاتھ پھیلاتی ہوں۔ جو مجھے درکار ہے صرف وہیں سے مل سکتا ہے اور جب اس کا ملنا مناسب ہو گا آپ سے آپ مل رہے گا۔ مجھے میرا خدا کافی ہے۔

پانچ برس نظر بند رکھ کر جب دسمبر 1919ء میں دونوں بھائیوں کو رہا کیا گیا تو لوگوں کے دل خوشی اور جوش سے بھر گئے۔ دہلی، لاہور، بمبئی وغیرہ میں ان کا استقبال نہایت شان و شوکت سے ہوا اور جلوس نکالے گئے۔ بی اماں کی خواہش تھی کہ اب دونوں بیٹے کچھ دن ان کے پاس رہیں لیکن لوگ محمد علی کو وفد خلافت کا صدر بنا کر لندن بھیجنے کی تجویز پیش کر رہے تھے اور اس طرح کئی مہینوں کے لیے ان کا گھر ہی سے نہیں بلکہ وطن سے دور رہنا لازمی تھا۔ بی اماں سے کہا گیا تو انہوں نے اپنی دیرینہ آرزو پر اس بات کو ترجیح دی اور کہا "میں یہ چاہتی تھی کہ اب جو میرے بیٹے میرے پاس آ گئے ہیں تو کچھ عرصہ میرے پاس ہی رہتے لیکن مجھ سے کہا گیا ہے کہ جس کام کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کی ہے اس میں ان کا مصروف رہنا میرے پاس رہنے کی نسبت زیادہ ضروری ہے اور چند مہینوں کے لیے ان میں سے ایک کو یا دونوں کو باہر رہنا پڑے گا۔ اس لیے میں بہت خوشی کے ساتھ ملک و قوم کے مطالبے کو منظور کرتی ہوں۔ ہندوستان کی آزادی اور اسلام کے کام کے لیے مجھے ان کی جدائی گوارا ہے"۔

اسی طرح جب تحریک خلافت کے سلسلے میں مولانا محمد علی ستمبر 1921ء میں کراچی پہنچے تو وہاں ایک تقریر میں انہوں نے کہا "برطانوی فوج کی نوکری حرام ہے" اس کی پاداش میں مولانا کو دو سال قید کا حکم دے دیا گیا تاریخ میں یہ مقدمہ "مقدمہ سازش کراچی" کے نام سے مشہور ہوا اور پورا ہندوستان ان کی دوبارہ جدائی پر ماتم کدہ بن گیا۔ لیکن بی اماں نے ان کی جدائی پر جیسا صبرو شکر کیا وہ ذیل کے خط سے واضح ہوتا ہے، جو انہوں نے آغا محمد صفدر صاحب کی گرفتاری پر ان کی بیوی کو لکھا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

"آج عزیز صفدر کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی خدمات خدا کی بارگاہ میں مقبول ہوئیں۔ میں اس زمانے کو بہار تعبیر کرتی ہوں۔ جب میں نے محمد علی کی سزا کی خبر سن کر دو رکعت نماز شکر ادا کی تھی۔ تم بھی ہمت سے کام لینا اور ہمت نہ ہارنا۔ مسلمان کی شان یہی ہے کہ وہ ہر حالت میں راضی برضا رہے"۔

علی برادران جب گرفتار ہوئے تو بی اماں خاصی کمزور ہو چکی تھیں اور سہارے کے بغیر مشکل سے ہی کھڑی ہو سکتی تھیں لیکن بیٹوں کی گرفتاری نے ان میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ انہوں نے تحریک خلافت میں بھرپور حصہ لیا۔ وہ دور دراز کے سفر کرتیں، بڑے بڑے اجتماعات کو مخاطب کرتیں۔ ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے تحریک خلافت کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ جگہ جگہ ان کی آواز پر ہزاروں کے عطیات خلافت فنڈ میں جمع ہوئے۔ ایوان حکومت میں کھلبلی تھی۔ مسٹر ہیلی نے علی برادران پر لگائے گئے الزامات میں یہ

الزام بھی شامل کیا تھا کہ ان کے گھر کی عورتیں بھی عطیات جمع کر رہی ہیں۔

جیسے جیسے حکومت کا رویہ سخت ہوتا گیا بی اماں کا لب ولہجہ بھی شدت اختیار کرتا گیا۔ وہ عوامی جلسوں میں زور و شور سے تقریریں کر رہی تھیں مشہور نظم "صدائے خاتون"

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
تم تو جاتے ہو دو دو برس کو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
کلمہ پڑھ پڑھ کے پھانسی پہ چڑھنا
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اسی دور کی یادگار ہے

بیٹوں کی رہائی کے بعد بھی بی اماں کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں حال آں کہ صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ کانگرس کے اندرونی اختلافات، ہندو مسلم نفاق اور جزیرہ نما عرب میں ہونے والے واقعات بدستور ان کی توجہ کا مرکز رہے۔ 1923ء میں وہ مولانا شوکت علی کی رہائی کے بعد ان سے ملنے کاٹھیاواڑ گئیں۔ پھر بمبئی، بیجاپور اور کوکناڈہ کے سفر کیے۔ مولانا شوکت علی کے ساتھ کانگرس کے اجلاس کے بعد وہ سیلون بھی گئیں اور موثر تقریریں کیں۔ مولانا محمد علی نے اس سلسلے میں لکھا ہے "بھائی صاحب نے منع بھی کیا کہ ہم آ گئے ہیں اور پوری ہمت اور مصروفیت کے ساتھ کام کریں گے آپ کے اب دن رات کے سفر اور دورہ کی ضرورت نہیں۔ آپ آرام کیجیے اور مطمئن رہیے، ہم کوئی دقیقہ ملک و مذہب کی خدمت گزاری کا اٹھا نہ رکھیں گے۔ مگر بی اماں نے نہ مانا اور فرمانے لگیں "تو مجھ پر رشک کرتا ہے کہ یہ بڑھیا میرے برابر ملک و قوم کی خدمت نہ کر سکے۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا کہ گھر پر پڑی رہوں اور اپنے ملک و مذہب کی کوئی خدمت نہ کر سکوں"۔

عمر عزیز کے آخری لمحات میں وہ بغرض علاج دہلی آئیں اور اس کے بعد مسوری اور پھر رام پور چلی گئیں۔ وہاں جا کر طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ مولانا محمد علی لکھتے ہیں "ہم لوگ فوراً ہی رام پور گئے مگر کئی دنوں تک حکومتی احکامات کی وجہ سے رام پور میں داخل نہ ہو سکے اور اسٹیشن پر ہی پڑے رہے۔ بی اماں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میرے بچے مجھ سے نہیں مل سکتے تو وہ اسی حالت میں اسٹیشن پر چلی آئیں اور اصرار کیا کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ مجبوراً ان کو دہلی لانا پڑا۔ یہاں ڈاکٹر انصاری کا علاج ہوتا رہا۔ مگر صحت روز بروز بگڑتی ہی چلی گئی۔ اور بالآخر وہ 13 نومبر کی شب 1924ء میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔ اور یوں 27 سال کی عمر سے جہاد میں مشغول یہ مجاہدہ عظیم دائمی سکون کی نیند سو گئیں۔

آپ نے اپنے بیٹوں محمد علی اور شوکت علی کو ایسی تربیت دی کہ انہوں نے اٹھ کر پورے ہندوستان کو ولولہ آزادی سے معمور اور تحریک آزادی سے متحرک کر دیا۔

شوکت علی اور محمد علی ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ان کے والد نے انتقال کیا۔ آبادی بانو جو بعد میں اپنے عظیم المرتبت فرزندوں کی وجہ سے بی اماں کے نام سے مشہور ہوئیں، انہوں نے اپنے شیر بچوں کی تعلیم و تربیت پر اپنی جوانی اور زندگی قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یہ انہی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ علی گڑھ ایم اے او کالج کے دو کھلنڈرے لڑکے کسی اعلیٰ سرکاری ملازمت کے طالب نہ ہوئے بلکہ بی اماں کی آغوش تربیت میں پل کر ان کے خداداد جوہر ایک خاص منزل کی طرف مڑ گئے اور جہاد آزادی کے سپہ سالار بن کر تاریخ میں امر ہو گئے۔

یہ صحیح ہے کہ بی اماں کو لوگ ان کے نامور بیٹوں کے کارناموں کی وجہ سے جانتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کا کردار بلکہ ان میں دینی اور سیاسی بصیرت بی اماں کی بدولت پیدا ہوئی تھی۔ یہ کہنا درست ہو گا کہ بی اماں کی عظمت کا باعث محمد علی اور شوکت علی نہیں تھے بلکہ محمد علی اور شوکت علی کی عظمت کا راز بی اماں کی عظمت میں مضمر تھا۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی، علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے زمانے ہی سے اپنے غیرت مندانہ خیالات کی وجہ سے مشہور ہو چکے تھے۔ ان کی طبیعت کا یہ رجحان علی گڑھ کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی والدہ ماجدہ بی اماں کی ابتدائی تربیت کا کرشمہ بھی تھا۔ بلاشبہ اس عظیم ماں نے ماؤں کے لیے اور ان کے نامور فرزندوں نے بیٹوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ چھوڑا ہے۔

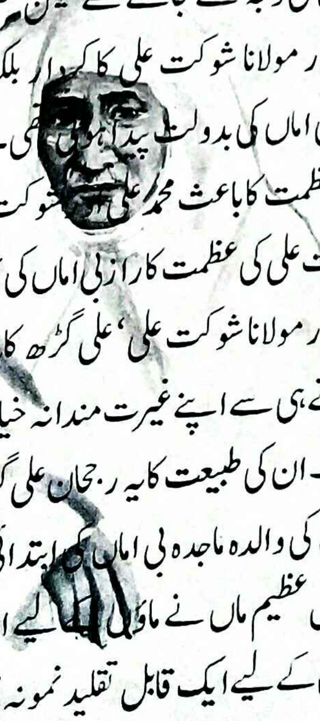

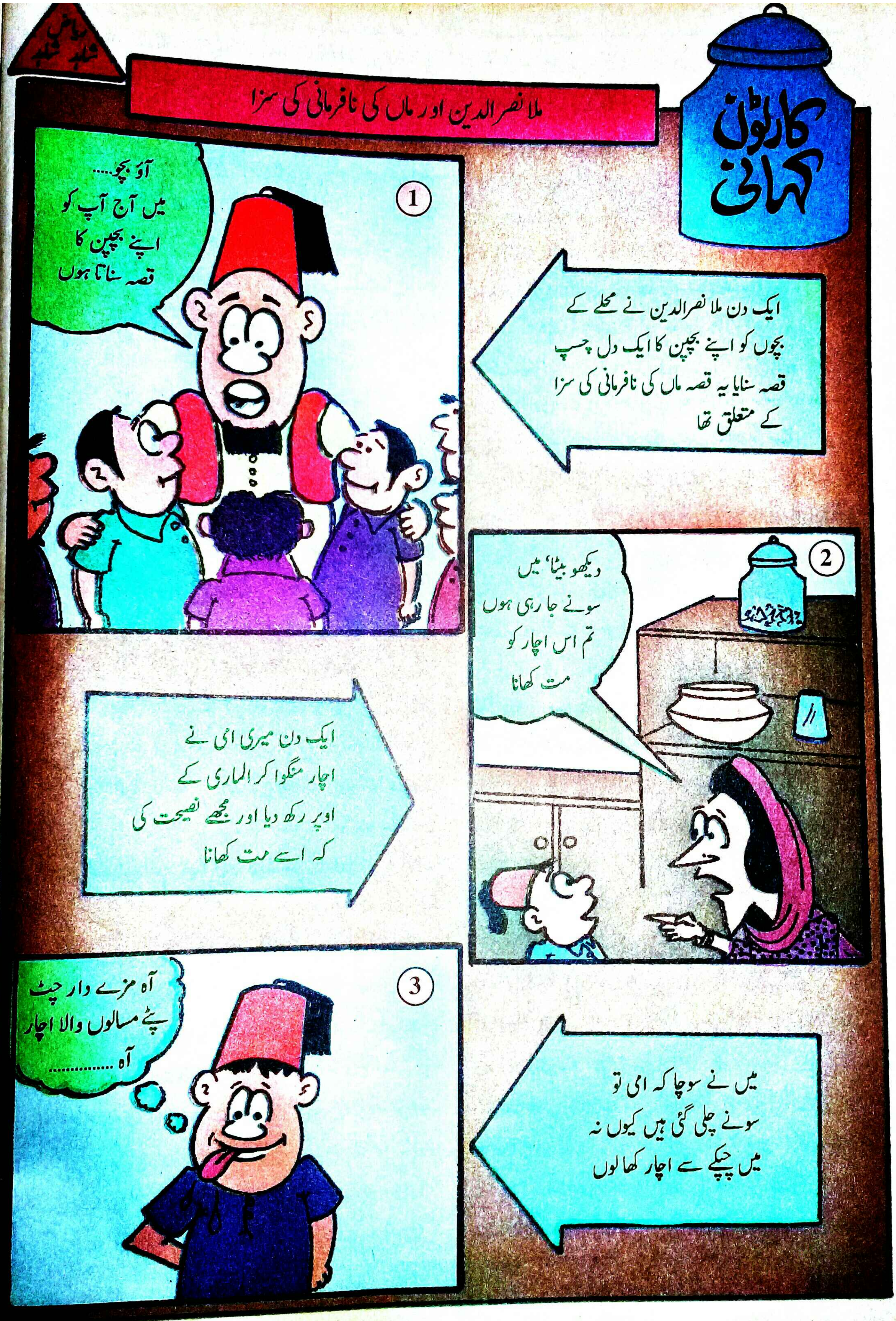

کارٹون کہانی
ملا نصرالدین اور ماں کی نافرمانی کی سزا
ایک دن ملا نصرالدین نے محلے کے بچوں کو اپنے بچپن کا ایک دل چسپ قصہ سنایا یہ قصہ ماں کی نافرمانی کی سزا کے متعلق تھا
1
آؤ بچو..... میں آج آپ کو اپنے بچپن کا قصہ سناتا ہوں
ایک دن میری امی نے اچار منگوا کر الماری کے اوپر رکھ دیا اور مجھے نصیحت کی کہ اسے مت کھانا
2
دیکھو بیٹا، میں سونے جا رہی ہوں تم اس اچار کو مت کھانا
میں نے سوچا کہ امی تو سونے چلی گئی ہیں کیوں نہ میں چپکے سے اچار کھا لوں
3
آہ مزے دار چٹ پٹے مسالوں والا اچار آہ.............

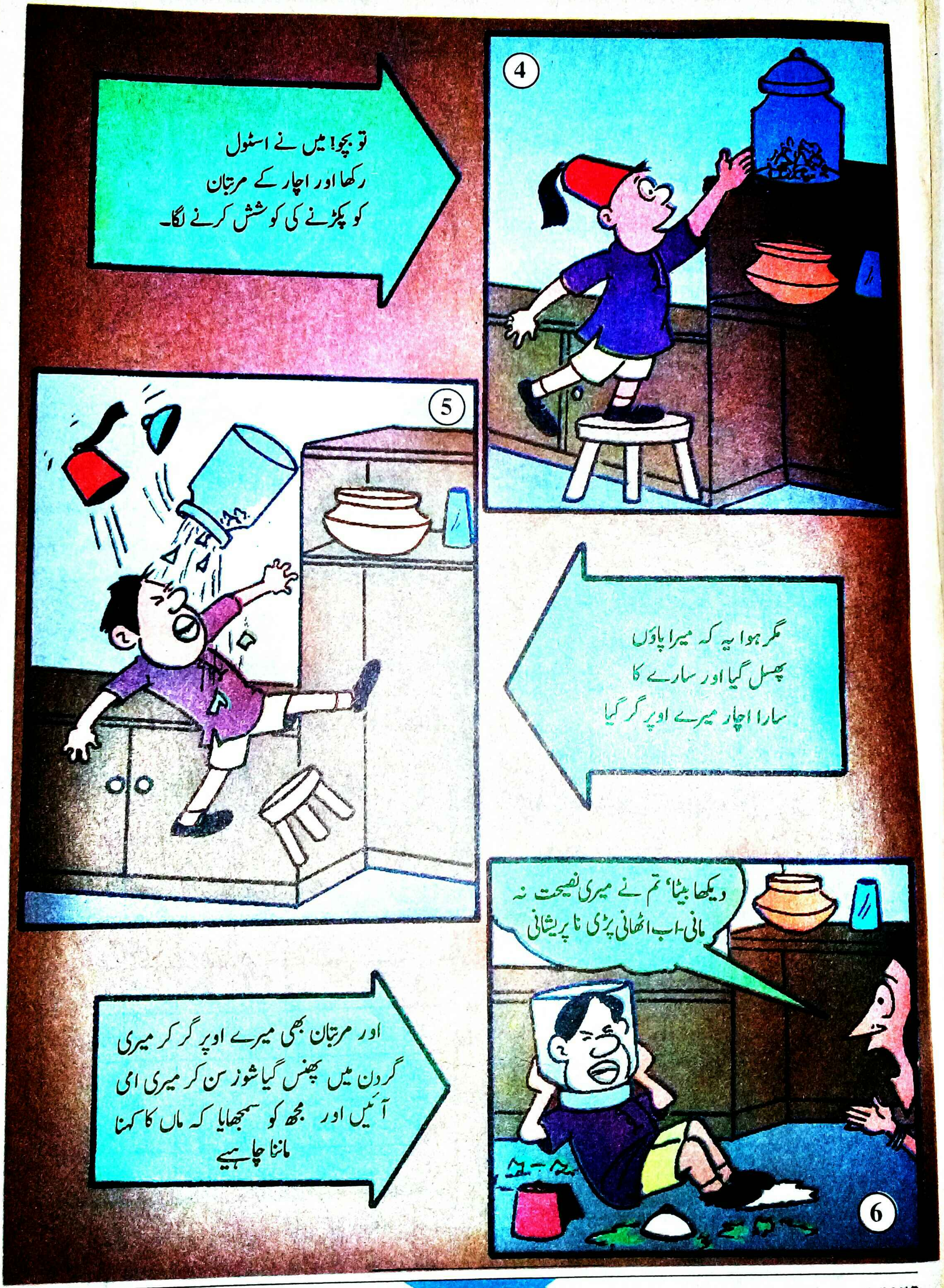

تو بچو! میں نے اسٹول رکھا اور اچار کے مرتبان کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔
4
مگر ہوا یہ کہ میرا پاؤں پھسل گیا اور سارے کا سارا اچار میرے اوپر گر گیا
5
دیکھا بیٹا' تم نے میری نصیحت نہ مانی۔اب اٹھانی پڑی نا پریشانی
6
اور مرتبان بھی میرے اوپر گر کر میری گردن میں پھنس گیا شور سن کر میری امی آئیں اور مجھ کو سمجھایا کہ ماں کا کہنا ماننا چاہیے

محسن علی محسن

ماں کا پیار

اماں مجھ کو پیار کریں
پیار کی وہ بھرمار کریں
جب اسکول سے آؤں میں
تب بھی مجھ کو پیار کریں
جلدی جلدی نہاؤں میں
تب بھی مجھ کو پیار کریں
اور پھر کھیلنے جاؤں میں
تب بھی مجھ کو پیار کریں
پیار کی وہ بھرمار کریں
پھر جب کھیل کے آؤں میں
تب بھی مجھ کو پیار کریں
پھر کچھ پڑھ کے سناؤں میں
تب بھی مجھ کو پیار کریں
اور پھر سونے جاؤں میں
تب بھی مجھ کو پیار کریں
پیار کی وہ بھرمار کریں
اماں مجھ کو پیار کریں

شرارتی لکیریں

شاہد ریاض شاہد

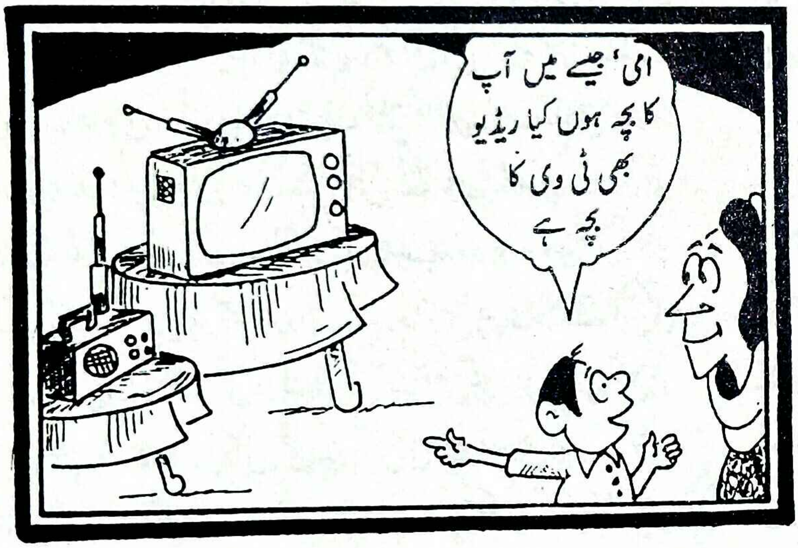

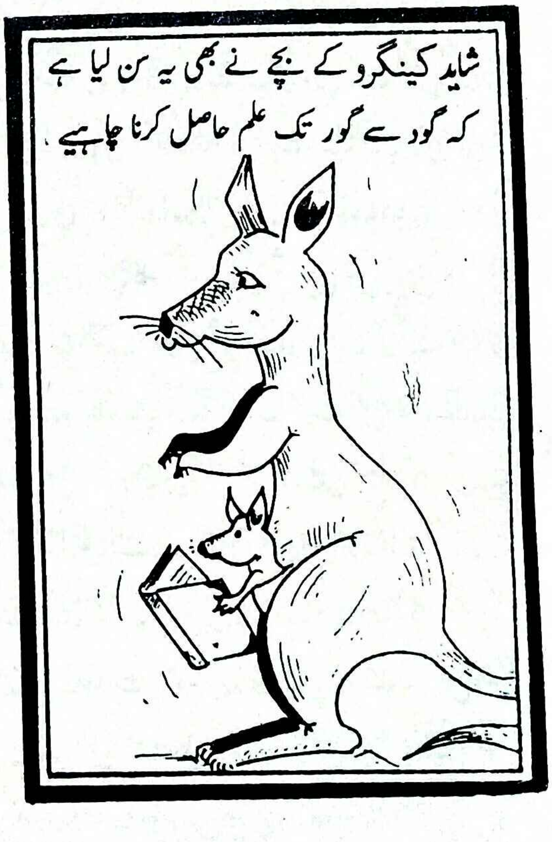

سیدہ طیبہ ہاشمی

عظیم ماؤں کی تربیت کے شہ پارے

گھر کے کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود اس کی نگاہیں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ سے بھی بے خود سی ہو کر وہ باہر کی طرف لپکتی مگر ہر بار اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس بار بھی دستک پر اس کے ہاتھ الماری سے برتن نکالتے ہوئے رک گئے اور ایک بار پھر بے خود ہو کر وہ دروازے تک پہنچی۔ مگر اس بار بھی دروازے پر وہ مانوس چہرے نہ تھے جن کی وہ بے چینی سے منتظر تھی۔ بلکہ ان کی جگہ اس کی پرانی سہیلی تھی جو کسی کام کے سلسلے میں آئی تھی۔ وہ اس کی بے قراری اور بے چینی بھانپ کر بولی "تمہارے ساتوں بیٹے اپنے اپنے ملکوں کے بادشاہ ہیں تم پھر بھی ان کے لیے اتنی فکر مند رہتی ہو۔ وہ تو اپنی دنیا میں مست ہیں مگر تم پھر بھی ان کے لیے ہر طرح کا بندوبست رکھتی ہو۔ روزانہ ان کے لیے کھانا بناتی ہو، روزانہ ان کے لیے بستر لگاتی ہو؟"

جواب میں اس نے کہا "نا جانے کب میرے بیٹوں کی بادشاہت ختم ہو جائے اور وہ ہر طرف سے ناامید ہو کر بھوکے پیاسے ماں کے پاس آجائیں"۔

ماں کی محبت اور شفقت کی یہ جیتی جاگتی تصویر میڈیم لیزا عظیم جنرل نپولین بوناپارٹ کی عظیم ماں تھی۔ نپولین اپنی تلوار اور علم و فضل کی بدولت آدھی دنیا پر حکمرانی کرنے والا عظیم حکمران تھا اور وہ بڑے بڑے جرنیلوں کو شکست فاش دے کر شہرت کے ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔

میڈم لیزا سات ملکوں کے بادشاہوں کی ماں تھیں لیکن اس کے باوجود وہ پیرس میں اپنے پرانے گھر میں رہتی تھیں۔ وہ دنیا کی واحد خوش قسمت ترین خاتون تھیں جن کے سب بیٹے مختلف ملکوں کے حکمران تھے بلکہ اس کی تینوں بیٹیاں کیرولین، پاولین اور ایلسی بھی تین مختلف ملکوں کے بادشاہوں کی بیویاں تھیں۔

نپولین نے اپنی ماں، میڈم لیزا کا سالانہ وظیفہ مقرر کر رکھا تھا لیکن وہ اس سے بہت کم خرچ کرتیں۔ ان کا خیال تھا کہ فرانس انقلابوں کی سرزمین ہے اور یہ پیسے وہ اپنے بچوں کے لیے سنبھال کر رکھتی تھیں کہ نجانے کب اس کے بیٹوں کو ان پیسوں کی ضرورت پڑ جائے۔

عالمی تاریخ ایسی عظیم ماؤں سے بھری پڑی ہے جن کی اعلیٰ تربیت نے ایسے سورماؤں کو جنم دیا۔ جنھوں نے اس کرہ ارض پر اپنی بہادری اور شجاعت کے ان مٹ نقوش چھوڑے اور تاریخ میں اپنے ناموں کو سنہری حروف میں لکھوایا۔ برصغیر پاک و ہند کی زرخیز سرزمین نے بھی ایسی بے شمار قد آور شخصیات پیدا کی ہیں جن کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ جنھوں نے اپنی ذہانت اور محنت سے ایسے کارنامے سرانجام دیئے جن پر دنیا آج بھی حیران ہے۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو غلامی کے اندھیروں سے نکال کر صبح آزادی کی نوید دی۔ ان کی عظمت اور شہرت کے پیچھے بھی ان کی پہلی درسگاہ، یعنی ماں کی گود کا کردار بڑا نمایاں نظر آتا ہے۔

ایسی ہی ایک درس گاہ مٹھی بھائی شیریں ہیں۔ جن کا تعلق دھرنا نامی گاؤں سے تھا۔ آپ انتہائی شریف اور محبت کرنے والی ماں تھیں۔ انہیں اپنے ہونہار بیٹے سے بے حد محبت تھی۔ ان کے بیٹے کا نام محمد علی تھا۔ جس نے انتہائی مختصر عرصے میں مسلمانوں کی بے خواب آنکھوں کو آزادی جیسے خواب کی تعبیر دی اور قائداعظم کے لقب سے نوازے گئے۔ آپ کراچی میں 25 دسمبر 1876ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن میں آپ بہت کمزور اور دبلے پتلے تھے۔ مٹھی بھائی شیریں کو ہر وقت آپ کی صحت کی تشویش رہتی۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ آپ کا عقیقہ وہ حسن پیر کی درگاہ پر جا کر کریں گی اور

وہاں اپنے بیٹے کی صحت کے لیے دعا کریں گی۔

قائداعظم شروع ہی سے بہت حساس اور ذہین تھے۔ وہ اکثر مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر غمگین ہو جاتے۔ ایسے میں آپ کی والدہ کے ہمدردی بھرے الفاظ تسلی کا کام دیتے۔ وہ آپ کو زیادہ سے زیادہ پڑھنے کے لیے کہتیں اور سمجھاتیں کہ پڑھ لکھ کر ہی ہم انگریزوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور اپنے ملک کو غلامی کی آہنی زنجیروں سے آزاد کرواسکتے ہیں۔

آپ کی والدہ کو آپ سے کچھ زیادہ ہی محبت تھی اور آپ بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے ہر حکم کو اپنا فرض جانتے تھے اور کبھی اپنی والدہ کی دل آزاری نہ کرتے تھے۔ آپ کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہر جانے سے پہلے آپ کی والدہ آپ کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ حالاں کہ آپ ابھی شادی نہیں کروانا چاہتے مگر آپ نے اپنی والدہ کے حکم کے آگے سر جھکا دیا۔ آپ کی والدہ بیٹے کے باہر جانے کے بعد بہت اداس رہتی تھیں اور ان کے جانے کے تھوڑے عرصے بعد اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں۔ جس کا قائداعظم کو بہت رنج ہوا اور وہ کافی عرصہ اسی غم میں مبتلا رہے۔

یہ آپ کی والدہ کی محنت اور توجہ کا نتیجہ تھا کہ آپ نے برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کو غلامی سے نجات دلانے کا بیڑا اٹھایا اور اس میں سرخرو ہوئے۔ مٹھی بھائی شیریں بلند حوصلہ اور ایثار کی پیکر خاتون تھیں۔ آپ نے اپنے جگر گوشے کی اس طرح تربیت کی کہ ان کے کارناموں کی بنیاد پر ان کا نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے میں بہتری ہوتی ہے۔ بعض اوقات انسان جذباتی ہو کر اس کے کسی فیصلے پر زبان پر حرف شکائت لے آتا ہے جو کسی طور بھی مناسب نہیں۔ سوتیلی ماں کے ظلم اور حسد کے بارے میں بہت ساری کہانیاں آپ نے سنی ہوں گی مگر ماں خواہ سوتیلی ہو یا سگی وہ بھی ایک عورت ہوتی ہے اور ضروری نہیں کہ عورت سوتیلی ماں کے روپ میں چڑیل یا ظالم ہی ہو بلکہ بعض سوتیلی ماؤں نے اپنی سوتیلی اولاد کی پرورش اس انداز میں کی کہ لوگوں نے اس پر رشک کیا۔ یہاں ایسی ہی ایک سوتیلی ماں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جس کی بہترین تربیت نے ایک عام سے بچے کو ایک بہت بڑے ملک کا صدر بنا دیا اور پھر اس صدر نے صدارتی عہدے پر پہنچنے کے بعد اپنی قوم کو غلامی جیسی لعنت سے نجات دلائی اور اسے غیرت مند قوم کے طور پر دنیا کے سامنے لا کھڑا کیا۔

دراز قد، مضبوط بدن والا، دوسروں سے محبت اور ہمدردی کرنے والا، دیانت دار اور خدا پرست آدمی جس نے ہمیشہ برائی سے پیچھا چھڑایا۔ نہایت مہربان اور فیاض دل، سچا اور بلا کا دوراندیش ابراہیم لنکن جو امریکا کی سرزمین پر اپنے اوصاف کا صرف ایک ہی آدمی ہو گزرا ہے۔ وہ 12 فروری 1809 کو "ہاجن وے" امریکا میں ایک معمولی بڑھئی کے ہاں پیدا ہوا۔ 9 سال کی عمر میں اس کی ماں فوت ہوگئی۔ مگر اس کی دوسری ماں نے اسے زندگی میں کبھی اپنی سگی ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ قدم قدم پر اس عظیم عورت نے اس کا ساتھ دیا۔ اسے غربت کی گود سے اٹھا کر پڑھایا لکھایا۔ اس کی ہر ضرورت کو پورا کیا اور اس کے ذہنی رجحان کو دیکھتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

لکڑی کی معمولی جھونپڑی میں پیدا ہونے والے اس عام سے بچے نے 6 نومبر 1860ء کو امریکا کا صدر بن کر یہ بات ثابت کر دی کہ ماں ایک ایسی عظیم ہستی ہے جس کی تربیت و شفقت سے انسان بڑے سے بڑے مقام پر پہنچ سکتا ہے۔ اپنی ماں کی عظمت کے اعتراف میں وہ خود بھی کہتا تھا کہ "جو کچھ میں ہوں اور جو کچھ میں کر رہا ہوں یہ سب میری فرشتہ خصلت ماں کی عنایت کا نتیجہ ہے"۔

وہ ہمیشہ اسے انصاف پسندی کی تاکید کرتی اور خدا کے کلام کو زیادہ سے زیادہ پڑھنے کے لئے کہتی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ شرافت اور محنت سے اپنی منزل تلاش کرے۔ اس لیے وہ اسے برائی سے دور رہنے اور اچھائی کی راہ پر چلنے کی تلقین کرتی۔ اس کی محنت کا نتیجہ تھا کہ وہ ایک راست باز، منصف انسان اور عظیم صدر بنا۔

تاریخ میں ایسے ایسے نامور لیڈر ہو گزرے ہیں جنہوں نے ملکی سیاست کو ایک نیا رنگ دیا، ایک نیا راستہ دکھایا۔ لیکن ان سب کے پیچھے ماں کی گود جیسی عظیم درس گاہ کا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ ان میں مسولینی بھی ایک ایسا ہی لیڈر تھا۔ وہ ایک بہادر اور نڈر جرنیل تھا۔ وہ اپنی قوم کو بھی ایسا ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر انسان کو ایسا بہادر اور جانباز ہونا چاہیے کہ وہ کسی بھی وقت کسی

بھی فرد کا مقابلہ کر سکے۔

بینٹو مسولینی نے 1922ء سے لے کر 1943ء تک اٹلی پر حکومت کی۔ وہ "درانوڈی کاسٹا" میں ایک لوہار کے ہاں 19 جولائی 1883ء کو پیدا ہوا۔ اس کی ماں روزا (Rosa) نہایت صابر اور باوفا عورت تھی۔ وہ گھر کو چلانے کے ساتھ ساتھ ایک پرائمری اسکول میں بھی پڑھاتی تھی۔ مسولینی کو اپنی والدہ سے بہت محبت تھی مگر وہ ان سے کچھ ڈرتا بھی تھا۔ اس لیے کہ وہ تھوڑی سخت طبیعت کی تھیں۔ مگر وہ اس کی تربیت کی طرف سے کبھی غافل نہ ہوتیں۔ اس لیے وہ ڈرنے کے باوجود ان سے شدید محبت کرتا تھا۔ انہوں نے مفلسی کے باوجود اس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے اسے بورڈنگ اسکول میں داخل کروایا۔ وہ اکثر اس کی ذہانت اور لیاقت دیکھ کر کہتیں کہ میرا بیٹا بہت ہونہار ہے اور بڑا ہو کر بہت بڑا آدمی بنے گا۔

مسولینی کا کہنا ہے کہ وہ دن میری زندگی کا سب سے برا دن تھا جب میں آرمی میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شہر سے باہر تھا اور وہاں مجھے اپنی ماں کے بیمار ہونے کی اطلاع ملی۔ میں نے آنے میں بہت جلدی کی مگر میرے گھر پہنچتے ہی انہوں نے جان دے دی۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت میری ذہنی کیفیت کیا تھی۔ وہ عظیم ہستی جس کی محنت اور توجہ نے مجھے دنیا کی نظروں میں ایک معتبر مقام دیا وہ مجھے یوں اکیلا چھوڑ گئی۔ اس نے کیسی کیسی تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کر کے مجھے پالا تھا۔ ہر طرح کے دکھ میری خاطر برداشت کئے تھے۔

ایک شہزادی کا بیٹا جو اپنے عہد کا سب بڑا فاتح اور سب سے بڑا سپہ سالار تھا۔ جس نے کم عمری میں مغرب سے اپنی مہم کا آغاز کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آدھی دنیا پر غالب آ گیا۔ شیر کی مانند مضبوط اعصاب کا مالک کہ جس نے اپنی تلوار سے بڑے بڑے سورماؤں کو شکست فاش دی اور فاتح مشرق و مغرب کہلایا۔ جو اپنے نام کی طرح اپنے اندر بے پناہ مضبوطی لیے ہوئے تھا۔ 356 ق۔م کو شاہ فیلقوس (فلپ دوم) جو ریاست مقدونیہ کا بادشاہ تھا کے ہاں پیدا ہوا۔ اس کی والدہ اولمپیاس "ایپی۔رس" کی شہزادی تھی۔ سکندر کو خوبصورتی اور وجاہت اپنی ماں سے ورثے میں ملی تھی۔ اسے اپنے اکلوتے بیٹے سے شدید محبت تھی۔ مگر وہ اپنے بے جا لاڈ پیار سے اسے بگاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے وہ کبھی کبھی سختی سے کام لیتی۔ وہ اس کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی توجہ فنون حرب کی طرف مائل کرواتی۔ سکندر شروع شروع میں امور سلطنت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خوابوں میں رہنے اور زیادہ سے زیادہ کتابیں پڑھنے کا عادی تھا مگر اس کی ماں اسے کتابوں اور خیالوں کی دنیا سے نکال کر عمل کی دنیا میں لانا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بیٹے میں قائدانہ صلاحیتیں موجود ہیں اس لیے اس نے اس کے سپہ سالاری کے جوہر مزید نکھارنے کے لئے ارسطو کو اس کا اتالیق (استاد) مقرر کیا۔ ماں کی محنت اور توجہ نے سکندر کو اک نئی روش سے متعارف کروایا اور اس نے اپنی ذہانت سے ایسے کارنامے سرانجام دیئے جن کا تاریخ میں کوئی جوڑ نہیں۔

وہ جب کسی جنگی محاذ پر جاتا تو اس کی والدہ باقاعدہ اسے دور تک سمجھاتی رہتی۔ اس میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے کے لئے بہادروں کی مثالیں دیتی۔ جنگ کے نفع و نقصان کے بارے میں اسے بتاتی۔ اسے اکی لیز اور ہرقل کے نام سے پکارتی۔ وہ ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی۔ اس کے دل میں صرف ایک ہی آرزو تھی کہ اس کا بیٹا ایک کامیاب حکمران بنے۔ سکندر کو بھی اپنی ماں سے شدید محبت تھی اور اس نے اپنی محنت سے ماں کی اس آرزو کو عملی جامہ پہنا دیا۔

انسان کی کامیابی اس کی ماں کی دعاؤں اور تربیت کے مرہون منت ہے۔ ماں جس کی گود اس دنیا میں بچے کی پہلی درسگاہ ہے۔ یہیں سے وہ ہر بات سیکھتا ہے اور یہی باتیں زندگی بھر اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ان فاتحین جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے' کے علاوہ بھی تاریخ میں ایسی بے شمار عظیم ہستیاں ہیں جن کی فتوحات نے زمانے میں انہیں ایک منفرد مقام بخشا اور ان کے کارنامے رہتی دنیا تک تاریخ کے اوراق میں زندہ و جاوید رہیں گے۔ یہ سب ان کی ماؤں کی تربیت کی وجہ سے ہوا۔ دنیا میں ہزاروں ایسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے بہت سے عظیم کارنامے سرانجام دیئے۔ ان کی کامیابی کے راز کے پیچھے ان کی ماؤں کی تربیت ہی کارفرما تھی۔ یہ بات کہنا غلط نہ ہو گا کہ عظیم مائیں ہی عظیم شہ پاروں کو جنم دیتی ہیں اور ماں کی گود دنیا کی ہر درسگاہ سے عظیم ہے۔

☆ ☆ ☆

ایک حجام ایک ہپی کے بال کاٹتے ہوئے بولا
"کیا تم نیوی میں بھی کام کر چکے ہو؟"
"ہاں مگر تمہیں کیسے پتا چلا؟" ہپی نے حیرانگی سے پوچھا۔
تمہارے بالوں میں سے نیوی کی ٹوپی برآمد ہوئی ہے
(عبدالکریم راول پنڈی)

ناصر! (اپنی ماں سے): میں ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہوں۔
ماں (حیرانی سے): وہ کیسے؟
ناصر! ناممکن کا "نا" ہٹا کر
(آمنہ رشید رحیم یار خان)

ایک دوا فروش بھرے مجمعے میں اپنی دوا کی تعریف کر رہا تھا۔ اس نے کہا "حضرات' میں یہ دوا 20 سال سے فروخت کر رہا ہوں لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ دوا خراب ہے۔
مجمعے میں سے آواز آئی "ظاہر ہے مردے تو شکایت کرنے سے رہے"
(ندا ایوب اوکاڑہ)

ایک کنجوس مرنے لگا۔ ایک شخص بولا "اب تو آپ مر رہے ہیں کچھ خدا کی راہ میں دیتے جاؤ۔
وہ بولا: خدا کو جان تو دے رہا ہوں اور کیا دوں۔
(عبدالرزاق چٹھہ فیصل آباد)

ماں (بیٹے سے): سامنے والے باغ سے پھول توڑ لاؤ۔ بیٹا جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پھول کا پودا تھا۔
ماں: میں نے تمہیں پھول توڑنے کے لیے بھیجا تھا پودا کیوں اکھاڑ لائے؟
بیٹا! امی جان' گیٹ پر لکھا تھا کہ پھول توڑنا منع ہے
(محمد عارف ڈیرہ اسماعیل خان)

ایک لڑکے نے اسکول سے واپسی پر روتے ہوئے اپنی ماں سے کہا "تمام لڑکے میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں تمہارا سر بہت بڑا ہے"
ماں نے کہا "وہ سب بکواس کرتے ہیں۔ تمہارا سر تو بڑا خوبصورت ہے۔ اچھا اب رونا بند کر دو اور مجھے بازار سے دس کلو آم لا دو۔
لڑکے نے پوچھا "امی جان! سبزی والا تھیلا کہاں ہے؟"

"تھیلا تو اس وقت نہیں مل رہا" تم اپنی ٹوپی میں ہی لے آؤ" ماں نے جواب دیا
(شمس القمر عاکف فورملی)

ایک بوڑھی عورت اپنے توتے سے بہت تنگ آچکی تھی۔ وہ ہر وقت یہ کہتا تھا "اللہ کرے بڑھیا مر جائے"۔
بڑھیا کے پڑوسیوں کے پاس ایک مینا تھی جو اچھی اچھی باتیں کرتی تھی۔ ایک دن بڑھیا اپنا توتا پڑوسیوں کے پاس رکھ آئی تاکہ وہ بھی اچھی اچھی باتیں سیکھ لے۔

چند روز بعد بڑھیا ان کے گھر گئی۔ جیسے ہی اس نے وہاں قدم رکھا' توتے نے جلدی سے کہا "اللہ کرے بڑھیا مر جائے' مینا نے فوراً کہا "آمین"
(سائرہ واحد لاہور)

آپ بھی لکھیے

مجھے معاف کردو

ساجدہ غلام محمد، کراچی

وہ حیران پریشان ائرپورٹ کے باہر کھڑا تھا۔ اس کا تو خیال تھا کہ سب لوگ اسے خوش آمدید کہنے آئیں گے مگر وہاں تو صرف خالو جان تھے، وہ بھی بڑی بے رخی سے ملے۔ چپ چاپ سامان گاڑی میں رکھا اور ڈرائیور سے چلنے کے لیے کہا۔ اسامہ سے رہا نہ گیا اور پوچھ ہی لیا ”خالو جان، اور لوگ کیوں نہیں آئے اور آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

ٹھیک ہوں میں، بیٹھو گاڑی میں، میں نے کہیں اور بھی جانا ہے“ خالو جان نے تیز لہجے میں کہا اور اسامہ نے غور سے انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر بے زاری کی لہر تھی۔ راستے میں بھی اس کا ذہن الجھا رہا کہ آخر کیا ہوا ہے جو باقی لوگ نہیں آئے۔ ٹھیک ہے، قصور میرا ہی تھا مگر چھ ماہ بعد لوٹا ہوں۔ امی ہی آجاتیں، وہ بھی نہیں آئیں۔ اس کو تمام باتیں یاد آنے لگیں۔

یادوں کی دھند اس کے دماغ پر چھا گئی۔ جب ایک دن اس نے ابو جان سے کار کے لیے پیسے مانگے تھے۔ ابو کو کاروبار میں خاصا نقصان ہو رہا تھا، وہ کہاں سے دیتے۔ اسی بات پر ناراض ہو کر وہ امریکا اپنے دوست کے پاس چلا گیا۔ ائرپورٹ پر امی نے رو رو کر برا حال کرلیا تھا۔ بہن بھائی بار بار اسے جانے سے روک رہے تھے۔ ابو نے بارہا کہا کہ بیٹا! تھوڑے دن صبر کرو، حالات ٹھیک ہو جائیں تو لے دوں گا۔ مگر وہ سب کو روتا چھوڑ کر امریکا چلا گیا اور سب سے ناتا توڑ لیا۔ گھر والوں کو اپنی خیریت کی اطلاع بھی نہیں دی۔ دوست نے بار بار کہا کہ ایک فون ہی کرلو مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ یہاں تک کہ چھ مہینے گزر گئے۔ اور آج جب اس نے اپنے آپ پر غور کیا تو پتا چلا کہ سارا قصور تو اس کا اپنا تھا۔ اسے گھر کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے فرمائش کرنی چاہیے تھی اور اگر کرہی لی تھی تو صبر کرلیتا، اسے سب لوگ بہت یاد آرہے تھے، خاص طور پر امی جان۔

”چلو، گھر آگیا ہے“ اس کے خیالات کا تسلسل خالو جان کی آواز پر ٹوٹا۔ گھر پر نگاہ دوڑائی تو ساری یادیں دوبارہ تازہ ہو گئیں۔ جب وہ اور اس کا بھائی حمزہ کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔

”السلام علیکم! کیا حال ہیں؟“ اس نے گیٹ کے پاس بیٹھے چوکی دار سے پوچھا۔

”سلام صاحب، اپن تو بس ٹھیک ہی ہے۔ آپ اندر چلو“ پہلی بار کسی نے اسے تسلی بخش جواب دیا تھا۔ اندر گیا تو سب نے ایسا ظاہر کیا جیسے وہ اس گھر کا فرد نہ ہو، اجنبی ہو۔ بہن نے جب دیکھا تو بے رخی سے سلام کر کے فوراً اندر چلی گئی۔ حمزہ نے اسے دیکھ کر منہ پھیرلیا۔ ”حمزہ! تم بھی مجھ سے ناراض ہو؟“ اسامہ نے بے اختیار اس کا شانہ ہلایا۔

”مت ہاتھ لگاؤ مجھے، تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟“ اسامہ کو شدید دھچکا لگا۔ ”کیا ہوا ہے تمہیں، میں تمہارا بھائی ہوں اور چھ مہینے بعد آیا ہوں۔ اگر ملنا نہیں ہے تو ایسے تو مت کہو“۔

”آکر احسان کیوں جتلا رہے ہیں؟ ہم سے اجازت لے کر گئے تھے؟ تب بھی تو آسکتے تھے جب امی....“ حمزہ روہانسا ہو گیا۔

”کیا ہوا امی کو؟ کہاں ہیں وہ؟“ اسامہ نے جلدی سے پوچھا۔

”آپ کے جانے کے بعد امی کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر آپ.... آپ تو اپنی مرضی کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ آپ نے اپنی خیریت کی اطلاع دینا بھی گوارا نہ کی۔ آخری وقت بھی امی کی زبان پر آپ کا نام تھا۔ آپ قاتل ہیں.... آپ نے امی کو ہم سے

چھینا..... آپ نے ....." وہ آگے بول نہ سکا اور روتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسامہ کے دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ کیا امی چلی گئیں۔ اف میرے خدایا' یہ سب کیا ہو گیا۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس نے اپنے آپ کو تقریباً بند کر لیا تھا۔ گھر والوں کا رویہ اب کچھ ٹھیک تھا۔ ایک دن امی کی بہت یاد آئی تو وہ ان کے کمرے میں چلا گیا۔ سامنے امی جان کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ بے اختیار آگے بڑھا اور تصویر کو چوم لیا۔ "امی جان! مجھے معاف کر دیں۔ میں بہت برا ہوں۔ میں نے آپ کو ناراض کیا۔ حالانکہ قصور میرا ہی تھا۔ میں بد قسمت ہوں جو آپ کا آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔ امی جان! آپ مجھے معاف کر دیں گی ناں! آئی لو یو امی! آئی لو یو سو مچ"۔ وہ تصویر سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے ایک عجیب خیال آیا اور فوراً امی کی الماری کی طرف بڑھا۔ الماری کھولی تو ہر چیز پر گرد پڑی ہوئی تھی۔ امی کی ڈائری کو ڈھونڈا' گرد صاف کر کے کھولی تو اسے یکم اکتوبر کی ڈائری نظر آئی۔ اس نے پڑھنا شروع کیا۔

"آج اسامہ کو گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔ وہ بہت یاد آتا ہے۔ اس نے کوئی رابطہ بھی تو نہیں کیا۔ پتا نہیں خیریت سے پہنچا بھی ہے یا نہیں۔ اللہ اسے اپنی امان میں رکھے"۔

10-11-97 "آج میں نے کڑاہی گوشت بنایا' اسامہ کا پسندیدہ سالن' مگر وہ تو ادھر ہے ہی نہیں' اسی لیے کھایا بھی نہیں گیا اور ارادہ کر لیا کہ آئندہ تب تک نہیں بناؤں گی جب تک اسامہ واپس نہیں آ جاتا"۔

10-12-97 آج صبح سے طبیعت بوجھل سی ہے۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ ہلکا ہلکا بخار ہو رہا ہے۔ اسامہ کے ابو کہتے ہیں کہ میں اپنا خیال نہیں رکھتی' ہر وقت اسامہ کے متعلق سوچتی رہتی ہوں۔ کیا کروں آخر وہ میرا بیٹا ہے۔ ماں کو بیٹے کی یاد نہیں آئے گی تو اور کس کی آئے گی"۔

10-1-98 نیا سال شروع ہوئے تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا ہے مگر اسامہ کا کچھ پتا نہیں۔ نہ جانے کب اس کی ناراضگی دور ہو گی۔ بیٹے! تم جہاں کہیں بھی ہو ایک فون یا خط ہی لکھ دو۔ آج میں ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ انہوں نے کہا ہے کہ اپنے ذہن پر کسی طرح کا بوجھ سوار نہ کریں' مگر کیا کروں بیٹے کا کچھ پتا نہیں ہے۔ بتا کر بھی تو نہیں گیا۔

21-1-98 "دل میں اچانک تیز درد ہوتا ہے۔ لگتا ہے اب زندگی چند دنوں کی رہ گئی ہے۔ اسامہ ابھی تک نہیں آیا۔ اب تو اس کی شکل دیکھے کئی مہینے ہو گئے ہیں۔ پتا نہیں اسے دیکھ بھی سکوں گی یا...... اللہ اس کی حفاظت کرے"۔

آگے ڈائری لکھی نہیں گئی تھی۔ شاید لکھنے والا رہا ہی نہیں۔ اسامہ نے بے اختیار ڈائری چوم لی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے کو تیار تھے۔ اس نے امی کی تصویر کو ہاتھ میں پکڑا اور روتے ہوئے بولا "مجھے معاف کر دو ماں! مجھے معاف کر دو"۔

وہ رو رہا تھا کہ اچانک اس کے کندھے پر ہاتھ کا بوجھ محسوس ہوا۔ اس نے آنسو پونچھ کر پیچھے دیکھا تو ابو جان اور حمزہ کھڑے تھے۔ "ابھی پوری ڈائری نہیں پڑھی' ایک صفحہ رہتا ہے" ابو جان نے یہ کہہ کر ڈائری پکڑی اور صفحہ پلٹا کر اسامہ کے آگے کر دیا۔ اس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔

"جب میرا بیٹا اپنی ناراضگی دور کر کے گھر آ جائے تو اسے میری طرف سے معاف کر دینا کیوں کہ ماں کبھی اپنے بچوں سے ناراض نہیں ہوتی اور میں بھی ناراض نہیں ہوں"۔ (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

میری امی جان اور......

نادیہ مظہر' راولپنڈی

ہماری والدہ ہم تین بھائی بہنوں کو تین مختلف اسکولوں میں چھوڑتی ہیں۔ سب سے پہلے باجی سے کہتی ہیں "ارم اپنا بستہ اور تھرموس اٹھالو' دروازے کا لاک کھول لو" اور اسی اثنا میں اسکول کے گیٹ کے قریب گاڑی روکتی ہیں۔ باجی کے نیچے اترتے ہی گاڑی آگے بڑھا دیتی ہیں۔ میں پچھلے شیشے سے دیکھتے ہوئے باجی کے گیٹ کے اندر جانے کی اطلاع امی جان کو دیتی ہوں تو وہ گاڑی

کی اسپیڈ بڑھا کر جلد از جلد میرے اسکول کی طرف پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ چوں کہ وہ چاہ رہی ہوتی ہیں کہ گیٹ کے قریب مجھ کو بھی چند سیکنڈ میں اتاریں اور منصور کے اسکول کی طرف بڑھ جائیں۔ مگر بہت سے مہربان والدین ان کی یہ خواہش آسانی سے پوری نہیں ہونے دیتے۔ میں صرف ایک محترمہ کا قصہ بیان کرتی ہوں۔ ان کی لمبی سی گاڑی میں ایک چھ سات سال کا ہونہار بیٹا ہوتا ہے۔ وہ گیٹ کے قریب گاڑی بند کر کے نیچے اتر کر بچے کو باہر نکالتی ہیں۔ پھر اسے گود میں اٹھائے ہوئے گاڑی کے پیچھے آکر ڈگی کھولتی ہیں۔ بچے کا بیگ اٹھا کر اس کو پہناتی ہیں' لنچ بکس اور تھرموس اس کے کاندھوں پر لٹکاتی ہیں۔ ڈگی بند کرتی ہیں تو پیچھے پھنس جانے والی گاڑیوں میں سوار لوگ اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ اتنے میں وہ محترمہ اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر کچھ رقم نکالتی ہیں۔ بچہ جیب خرچ لے کر اسکول کی طرف چلتا ہے تو وہ اپنی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف جانے کے بجائے بچے کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے پیٹھ تھپ تھپاتی ہیں۔ پھر کہیں جا کر گاڑیوں کے ہارن کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔

اے کاش! وہ اور ان کی طرح کی دیگر سب مائیں بچوں کو جیب خرچ دینے اور پیار کرنے کے مرحلے گھر پر ہی طے کر آیا کریں اور اسکول کا بستہ بھی ساتھ رکھا کریں تاکہ ٹریفک جام نہ ہو اور اسکول کے قریب وقت پر پہنچنے کے باوجود بچوں کو "لیٹ لائن" میں نہ کھڑا ہونا پڑے (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

حق ادا نہیں ہوا

محسن سلیم' تلونڈی موسیٰ خان

نعمان سہ پہر کو دفتر سے آکر لیٹ گیا تھا۔ شام کو آرام کر کے اٹھا اور باہر لان میں چلا آیا۔ وہاں اس کی امی اور بہن سارہ چائے پی رہی تھیں۔ اس کی ماں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔

"بھیا آپ کے لیے چائے بناؤں" سارہ نے پوچھا۔

"ہاں بنا دو" نعمان نے جواب دیا "پھر مجھے جانا ہے" نعمان کی امی کہنے لگیں" بیٹا تم دفتر سے آنے کے بعد کہاں چلے جاتے ہو۔ دو گھڑی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔ میری آج طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے"۔

نعمان کہنے لگا "امی میں ہر وقت آپ کے پاس تو بیٹھا نہیں رہ سکتا اور رہی بات طبیعت کی' تو میں پیسے دے دوں گا جا کر دوائی لے آئیے گا"۔

"بیٹا' بات دوائی کی نہیں ہے' بات پیسوں کی بھی نہیں۔ میری تکلیف تو تمہیں دیکھتے ہی ختم ہو جاتی ہے"۔

"امی چھوڑیں ان افسانوی باتوں کو۔ اگر دو گھڑی آپ کے پاس بیٹھ بھی جائیں تو نصیحتوں کا پٹارہ کھول کر بیٹھ جاتی ہیں۔ میں دوستوں کے پاس جا رہا ہوں۔ ذرا دیر سے ہی آؤں گا"۔

سارہ نے ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے اور بھائی سے کہنے لگی "بھیا' آپ کو امی سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ پہلے ہی بیمار ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ان کی دل و جان سے خدمت کریں۔ جیسے انہوں نے ہمیں پالا پوسا ہے ہمیں بھی ان کا خیال رکھنا چاہیے"۔

"بس' بس میں زیادہ نصیحتیں سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ بتاؤ میں نے کبھی تم لوگوں کو روپے پیسے کی کمی ہونے دی۔ انہوں نے ہمیں پال پوس کر ہم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ ان کا فرض تھا۔ وقت پر دوائیں لا دیتا ہوں۔ کھانے پینے کی کمی نہیں ہے۔ لیکن سوری' میرے پاس ہر وقت ان کی پٹی سے لگ کر بیٹھے رہنے کا ٹائم نہیں ہے" نعمان یہ کہ کر باہر چلا گیا۔

اتوار کا دن تھا۔ نعمان کو دفتر سے چھٹی تھی۔ وہ آکر ناشتہ کرنے لگا اور میگزین کی ورق گردانی کرنے لگا کہ اچانک اس کی نظر ایک واقعہ پر پڑی۔ واقعہ کچھ یوں تھا "ایک شخص نے ننگے پاؤں اپنی ماں کو کندھوں پر اٹھا کر سات حج کروائے اور سوچا کہ میرا فرض پورا ہو گیا ہے۔ اتنے میں غیب سے آواز آئی کہ صرف اتنا سا کام کر کے تو سوچنے لگا کہ تیرا فرض پورا ہو گیا ہے؟ تو بہت چھوٹا تھا' شدید سردی تھی۔ تو نے بستر پر پیشاب کر دیا۔ تیری ماں نے تجھے خشک جگہ پر لٹا دیا اور خود گیلی جگہ پر لیٹ گئی۔ ساری رات اسی طرح سخت سردی میں گزار دی۔ تجھ سے تو ابھی

اس ایک رات کا حق نہیں ادا ہو سکا اور تو کہتا ہے کہ تیرا فرض پورا ہو گیا۔

نعمان یہ پڑھ کر بہت پشیمان ہوا۔ اسی وقت ماں کے پاس گیا اور اپنے کیئے کی معافی مانگی۔ اس کی ماں نے اسی وقت اسے معاف کر دیا۔ نعمان کو زیادہ شرمندگی اس بات پر ہوئی کہ اس کی اتنی گستاخیوں کو اس کی ماں نے صرف ایک لمحے میں معاف کر دیا۔ اس نے عہد کیا کہ وہ اپنی تمام گستاخیوں کا ازالہ کرے گا اور کبھی بھی ماں کے فرائض سے کوتاہی نہیں کرے گا اور انہیں پورا پورا وقت دے گا (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

صبح کا بھولا

غلام مصطفیٰ قادری، لاہور

"عائشہ بیٹی سوئیٹر پہن کر سہیلی کے گھر جاؤ۔ دسمبر کا مہینا ہے، بادل چھائے ہوئے ہیں۔ یوں باہر نکلو گی تو سردی لگ جائے گی" بارہ سالہ عائشہ سے اس کی والدہ نے کہا۔

"امی میں ایسے ہی ٹھیک ہوں" عائشہ نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

اس کا جواب سن کر امی کا پارا چڑھ گیا اور انھوں نے عائشہ کو ڈانٹا اور کہا "وہ دن یاد کرو جب تم چھوٹی تھی، رات کو بار بار اٹھ جایا کرتی تھی۔ میں تمہاری خاطر جاگا کرتی تھی، میں نے اپنا آرام و سکون تم پر قربان کیا اور تم ہو کہ میری بات جو ہے بھی تمہارے بھلے کی، مان نہیں رہی" یہ کہتے ہوئے عائشہ کی والدہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

عائشہ بھلا ان باتوں کو کیسے سمجھتی۔ بچے تو جب تک خود تجربہ نہ کرلیں یا اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں انہیں کسی بات کی سمجھ نہیں آتی۔ یہی حال عائشہ کا تھا۔

بادل نخواستہ، سوئیٹر پہن کر وہ اپنی سہیلی رابعہ کے گھر گئی۔ رابعہ کے گھر اس کی باجی آئی ہوئی تھیں اور ان کا دودھ پیتا پیارا سا بیٹا بھی ان کے ساتھ تھا۔ جس وقت عائشہ رابعہ کے گھر گئی۔ باجی کا پیارا سا منا رو رہا تھا۔ اس کی والدہ اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ عائشہ یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی کہ منے کو چپ کرانے میں اس کی والدہ کتنی پریشان ہو رہی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ منے کو کوئی تکلیف ہے۔ شاید پیٹ میں درد ہے۔ اس لیے اسے دوائی پلائی گئی تو تھوڑی دیر میں منا چپ ہو کر سو گیا۔

عائشہ، رابعہ سے مل کر واپس گھر آئی تو سارے راستے میں سوچتی رہی کہ جب میں چھوٹی تھی تو میری امی کو مجھے سنبھالنے، کھلانے پلانے، پہنانے میں کتنی محنت کرنی پڑی ہو گی جیسے رابعہ کی باجی کو اپنے بیٹے کی دیکھ بھال میں کرنی پڑ رہی ہے۔ اور میں ہوں کہ انہیں تکلیف پہنچاتی رہتی ہوں۔ کبھی کپڑے پسند کرنے میں ضد اور کبھی کھانا کھانے میں ضد سے میری والدہ کو کتنی تکلیف ہوتی ہو گی۔

میری والدہ کو اس وقت کتنا دکھ ہوا ہو گا جب میں سوئیٹر پہننے پر تیار نہ تھی۔ حالاں کہ وہ میری ہی حفاظت کے لیے پہنا رہی تھیں۔ ماں کتنی عظیم ہستی ہے۔ مجھے اپنی والدہ سے معافی مانگ لینی چاہیے اور بہتر ہے کہ میں ان کے لیے کوئی تحفہ لیتی جاؤں۔ تاکہ وہ خوش ہو جائیں۔ ہاں یاد آیا امی کو رس گلے بہت پسند ہیں۔ عائشہ نے رس گلے خریدے اور گھر آکر امی کو دے دیئے۔ "یہ کس لیے؟" امی نے پوچھا۔

"تاکہ میرے ضد کرنے سے آپ کو جو تکلیف ہوئی اس کا ازالہ ہو سکے" عائشہ نے کہا اور نظریں جھکا لیں۔ اس کی والدہ نے خوشی سے سرشار ہو کر عائشہ کو سینے سے لگا لیا اور کہا "بیٹی، صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے" (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

نتیجہ

صبا شفیق، فیصل آباد

ماں کی ہستی عظیم ہے۔ بے شک باپ بھی بچوں سے بہت

محبت کرتا ہے۔ مگر ماں جیسی دولت دنیا میں کوئی نہیں۔ ماں کی اولاد سے محبت لازوال ہے۔ کیوں کہ ماں کی محبت بے غرض اور بے لوث ہوتی ہے۔

ان باتوں کی سچائی کا علم ہمیں اپنے عملی تجربے سے ہوا۔ ایک دن نہ جانے ہمارے دماغ میں کیا سمائی اور ہم نے سوچا کہ اگر غلطی کریں اور ابو کا کہنا نہ مانیں تو ڈانٹ پڑتی ہے۔ لیکن اگر امی کا کہنا نہ مانیں تو امی کیا کریں گی۔ یہ راز معلوم کرنے کے لیے ہمارے ذہن میں فوراً ایک خیال آیا اور ہم اس ترکیب کی تکمیل کے لیے منہ بسور کر بیٹھ گئے۔

امی ہمارے پاس آئیں اور کہا کہ بیٹا ذرا میرے کپڑے استری کر دو۔ ہم نے کہا ہم نہیں کریں گے۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ امی نے ہمیں کچھ نہ کہا اور چلی گئیں۔ دوپہر کو پھر ہمارے پاس آئیں اور کہا ”بیٹا“ جاؤ ذرا پڑوسن کے گھر سے سلائی مشین لے آؤ۔ کئی دنوں سے انہی کے گھر پڑی ہے“۔

ہم نے نہایت اکتاہٹ سے جواب دیا ”ہمارے پاس وقت نہیں ہے ہم نہیں جاسکتے“۔

شام کو امی ہمارے پاس آئیں تو ہم منہ بسورے بیٹھے تھے۔ امی نے آکر ہمیں گلے لگایا اور کہنے لگیں ”میری چندا کیا ہوا تجھے؟ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

ہم جو توقع کر رہے تھے کہ اب خیر نہیں، دو بار امی نے برداشت کر لیا ہے اور اب ڈنڈا لے کر آئیں گی۔ امی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے اور ہم نے امی سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تو امی کہنے لگیں ”بیٹا“ کس بات کی معافی؟ کیسی معافی؟ چندا تو ٹھیک تو ہے؟“

پھر ہم نے امی کو بتایا کہ صبح اور دوپہر کو ہم نے جو گستاخیاں کیں وہ آپ کی محبت کا اندازہ لگانے کے لیے کیں۔ امی ہنسنے لگیں اور کہنے لگیں ”پھر کیا نتیجہ نکلا؟“

”یہی کہ امی جان زندہ باد“ ہم نے یہ کہا اور اس کے ساتھ ہی امی جان کے ساتھ چمٹ گئے (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

ایک واقعہ

فرحت حکیم رشید، حافظ آباد

پچھلی گرمیوں کے وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتی جب ہم سب چھت پر سو رہے تھے کہ اچانک تیز بارش آگئی۔ ہم سب اٹھ بیٹھے۔ میں جلدی سے نیچے آنے لگی تو امی نے کہا ”فری! کچھ برتن یا بستر نیچے لے جاؤ“

میں نے کہا ”مجھے نہیں پتا خود ہی لے آیئے“۔

شاید اللہ کو میرا انکار کرنا پسند نہیں آیا۔ میرا پاؤں پہلی سیڑھی سے جو پھسلا تو میں برآمدے میں آکر گری۔ امی جان چیخ مار کر میرے پیچھے اتریں۔ لیکن مجھے کوئی ہوش نہیں تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے ہوش آیا۔ سب گھر والے میرے اردگرد بیٹھے تھے۔ میرے منہ پر پانی کے قطرے گرے تو میں نے دیکھا کہ میری امی نے اپنی گود میں میرا سر رکھا ہوا ہے اور آنسو ان کی آنکھوں سے بہ بہ کر میرے منہ پر گر رہے ہیں۔ امی نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور پوچھا ”بیٹا“ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“

میں نے کہا ”وہ اب ٹھیک ہوں“

میری ماں نے کہا ”خدایا شکر ہے کہیں دماغ میں چوٹ نہیں لگ گئی“۔

میرا سر ندامت سے جھک گیا۔ میں نے امی جان کا کہنا نہیں مانا تھا اور وہ ہیں کہ ہر بات بھلا کر میرے لیے دعائیں مانگ رہی ہیں۔ میں نے اپنی پیاری، شفیق ماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگایا اور سچے دل سے توبہ کی کہ آئندہ کبھی ماں کی نافرمانی نہیں کروں گی۔ ماں کی محبت واقعی حقیقت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور ہر لمحہ اپنی اولاد کی خوشیوں کی طلب گار ہوتی ہے (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

☆ ☆ ☆

ہونہار مصور

سائنس دان

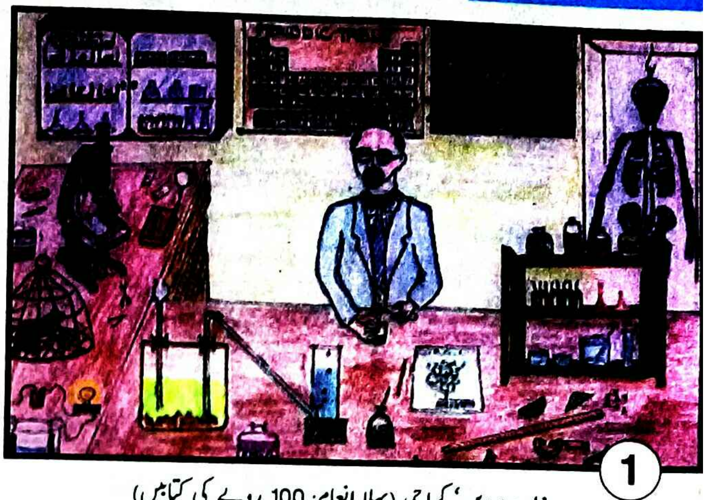

زاہدہ پروین، کراچی (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

سعدیہ نورین، گوجرانوالہ (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

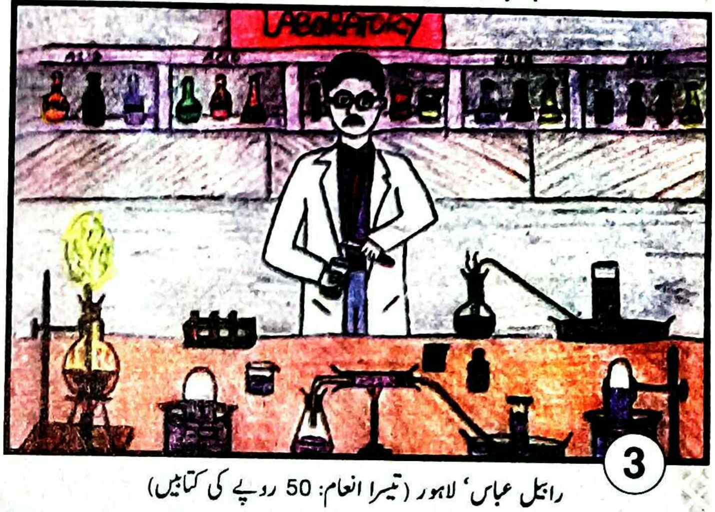

رابیل عباس، لاہور (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

تنزیلہ اخلاق، منڈی بہاء الدین (چوتھا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

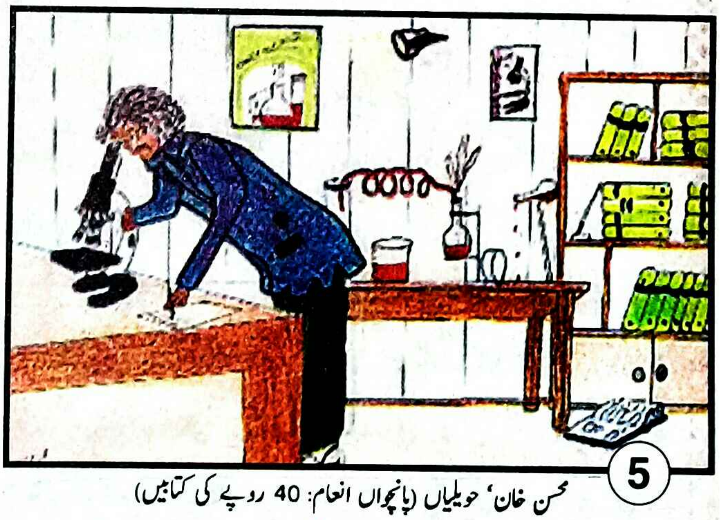

محسن خان، حویلیاں (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

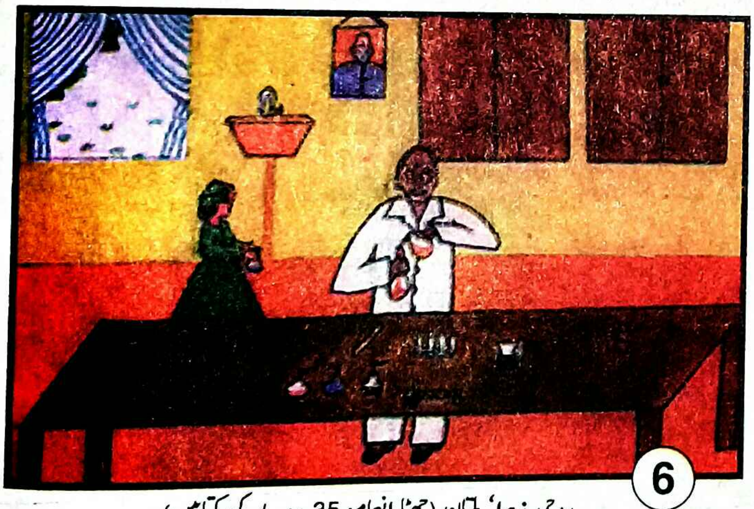

روحی زہرا، ملتان (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں: سید عمران ساجد جھنگ صدر۔ محمد عثمان طیب لاہور۔ سمیرا سلطان منہاس اسلام آباد۔ ساجد خان امان کوٹ مینگورہ۔ رانا محمد عابد رفیق فیصل آباد۔ ندا ستار لاہور۔ نائلہ محفوظ کیانی راول پنڈی۔ سعدیہ دل محمد لاہور۔ کرن اسلم بہاول پور۔ سید ذی شان ہاشمی لاہور۔ اصغر علی انصاری چک نمبر59ای بی۔ شہزادہ سلطان حافظ آباد۔ کنول ایاز ایبٹ آباد۔ محمد جنید اصغر ڈیرہ اسماعیل خان۔ حنا جاوید لاہور۔ فہد خبیب احسن منڈی بہاء الدین۔ عرفان اللہ خان ڈیرہ اسماعیل خان۔ حریا لطیف لاہور۔ اسما لطیف لاہور۔ عروج لطیف لاہور۔ محمد عبید قریشی شکردرہ۔ ذی شان جاوید کراچی۔ نعیم الوہاب پشاور۔ سید علی عرفان حیدر زیدی اخلاص گڑھ۔ صبا طاہر فیصل آباد۔ محمود الیاس خان پشاور۔ محمد بلال بابر پشاور۔ مہ جبیں کراچی۔ حنا لطیف لاہور۔ سدرہ سلیم لاہور۔ آصف کاشف سیٹھی چک نمبر59ای بی۔ عمار اکرم فیصل آباد۔ عزیز الرحمان قاری شیخوپورہ۔ عون حیدر ساہی وال۔ رائے عدنان منیر شیخوپورہ۔ سمیرا امین چکوال۔ کامران سلطان حافظ آباد۔ صبا فاطمہ پاک پتن۔ شیر نواز گل ارمڑ پایان۔ جہاں زیب حافظ آباد۔

مئی کا موضوع: قربانی کا جانور — آخری تاریخ 7 اپریل

جون کا موضوع: کھیل کا میدان — آخری تاریخ 7 مئی

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

نئی امّی

سلیم خان گمّی

(بخت رسا کی کہانی کی ڈرامائی تشکیل)

کردار

- عُمر: 7 سال کا بچّہ اور دوسری جماعت کا طالب علم
- دادی جان: 60 سال' ہاتھوں میں رعشہ' کبُڑی
- پھپھو: 16 سال' میڈیکل کی اَسٹوڈنٹ
- خاتون: 30 سال' سروقد' چہرے پر مُسکراہٹ
- نرس: 35 سال
- عاطف: 7 سال' اور عُمر کا ہم جماعت
- یاسر: 10 سال' اور عُمر کا ہم جماعت
- عالیہ: 7 سال' پڑوسن
- کرن: 10 سال اور عالیہ کی بہن
- بشیراں: 20 سال' دھوبن جو باتونی ہے

پہلا منظر

پردہ اُٹھتا ہے تو عُمر کمرے کی پچھلی دیوار کی طرف مُنہ کئے میز پر کتاب رکھے کُرسی پر بیٹھا نظر آتا ہے۔ لگتا ہے وہ پڑھ رہا ہے۔ اُس کی پھپھو تیزی سے کمرے میں آتی ہیں۔ وہ خوش دکھائی دیتی ہیں اور عُمر کے قریب آکر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہیں۔

پھپھو: عُمر! میں آج بہت خوش ہوں۔ بوجھو تو بھلا کیوں؟

عمر: (کُرسی سے اُٹھ کر) پھپھو جان' مجُھے تو پتا نہیں آپ خود ہی بتا دیجئے۔

پھپھو: مجُھے میڈیکل کالج میں داخلہ مِل گیا ہے۔ اب میں ہوسٹل میں رہوں گی۔ خوب پڑھوں گی' لیڈی ڈاکٹر بنوں گی۔

عُمر: پھپھو جان' ابّا جان بھی تو ڈاکٹر ہیں۔ پھر دو ڈاکٹر ہو جائیں گے ہمارے گھر میں۔ یعنی آپ اور ابّا جان۔

پھپھو: دو ڈاکٹر پہلے بھی تو تھے ہمارے گھر میں- ایک آپ کے ابا جان اور دوسری آپ کی امی جان-

عمر: ہاں لیکن امی جان کو تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس جنت میں بلوا لیا-

پھپھو: ہاں، آپ کی امی جان تو اب جنت میں ہیں-

عمر: (سوچتے ہوئے) اس کا مطلب یہ ہوا کہ پھپھو آپ ہوسٹل میں رہیں گی؟

پھپھو: جی عمر صاحب، چلو اب جلدی سے کپڑے تبدیل کر لو- یہ رہا آپ کا کوٹ- (پلنگ پر سے کوٹ اٹھا کر اسے دیتی ہے)

عمر: (کوٹ پہنتے ہوئے) پھپھو، دادی جان کہاں ہیں؟

پھپھو: ان کی طبیعت ذرا ٹھیک نہیں ہے- وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہیں- دوائی پلائی ہے-

عمر: پھپھو، آپ مجھے کپڑے پہنا کر کہاں لے جا رہی ہیں؟

پھپھو: کھانے کے کمرے میں اور کہاں؟ کھانا نہیں کھاؤ گے؟

عمر: (گھڑی دیکھ کر) ابھی کہاں؟ وقت نہیں ہوا کھانے کا-

پھپھو: میں نے سوچا آج چھٹی ہے- عمر کھانا کھا کر دوستوں کے پاس کھیلنے چلے جائے گا- اس لیے جلدی کی-

عمر: آج تو میرے دوست مجھے گھر پر ملنے آئیں گے- میں تو ان کے ساتھ کھیلنے نہیں جاؤں گا-

پھپھو: چلو ٹھیک ہے-

عمر: پھپھو ابا کب آئیں گے لندن سے؟

پھپھو: وہ دو مہینوں کے لیے گئے تھے بس اب آنے والے ہیں- میں اب ہوسٹل میں رہوں گی- آپ کی دادی جان اکثر بیمار رہتی ہیں- میں تو اب گھر کبھی کبھار ہی آیا کروں گی- کتنا ہی اچھا ہو اگر آپ کے ابا جان نئی امی لے آئیں-

عمر: (خوش ہو کر) نئی امی واہ جی واہ

پھپھو: واقعی، واہ جی واہ، نئی امی- بہت اچھی نئی امی!

عمر: اب ابا جان کا لندن سے ٹیلی فون آیا تو میں کہوں گا کہ نئی امی کو لے آئیں- وہ آجائیں گی تو میں میں، پتا ہے کیا کروں گا، میں ان کے ساتھ سویا کروں گا- ان کی گود میں

(عمر خوشی سے ناچتا ہے)-

ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے- پھپھو چونگا اٹھاتی ہے-

پھپھو: ہیلو، ہیلو بھائی جان، السلام علیکم سب ٹھیک ہیں- آپ کیسے ہیں.....؟- شکر ہے..... میرے پاس ہے- عمر لیجیے بات کیجیے- (عمر سے) عمر بات کرو اپنے ابا جان سے

عمر: ہیلو پاپا..... ٹھیک ہوں- بالکل ٹھیک ہوں- کب آؤ گے؟ جب آؤ تو نئی امی ضرور لانا- اچھی سی- پھپھو میڈیکل کالج میں چلی جائیں گی- وہ ہوسٹل میں رہیں گی- دادی جان بیمار رہتی ہیں- میں اداس ہو جاؤں گا..... ہیں؟ انتظام کر لیا ہے نئی امی کا! تھینک یو پاپا- (ٹیلی فون کا چونگا رکھ کر پھر خوشی سے ناچنے لگتا ہے- عاطف اور یاسر آتے ہیں)

پھپھو: آپ کے دوست آگئے ہیں- اب میں چلتی ہوں-

عمر: یہ تو میرے کلاس فیلو ہیں، عاطف اور یاسر

(وہ پھپھو کو سلام کرتے ہیں- پھپھو جیتے رہو کہ کر چلی جاتی ہے)

عاطف: بہت خوش ہو عمر، کیا بات ہے؟

عمر: میری نئی امی آ رہی ہیں

عاطف: ہیں؟ کیا کہا؟ نئی امی؟ پرانی امی کہاں گئیں؟

عمر: وہ تو سال پہلے اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں-

عاطف: یوں کہو ناں کہ وہ فوت ہو گئی تھیں-

یاسر: ایسے نہیں کہتے عاطف

عاطف: ہاں، ایسے نہیں کہتے- عمر کی امی اللہ کے پاس ہے-

یاسر: اب عمر کے ابو عمر کے لیے نئی امی لا رہے ہیں-

عاطف: کہاں سے؟

یاسر: لندن سے- عمر کے ابا جان لندن گئے ہوئے ہیں ناں-

عمر: ابا جان سے ابھی میری بات ہوئی ہے ٹیلی فون پر، وہ میرے لیے نئی امی لا رہے ہیں- اچھی امی، سمجھے؟

یاسر: میں تو بہت خوش ہوں کہ آپ کی نئی امی آ رہی ہے-

عاطف: خوشی کی کون سی بات ہے- نئی امی تو ہو گی مگر سوتیلی بھی تو ہو گی..... سوتیلی امی-

عمر: سوتیلی امی؟

عاطف: ہاں وہ تیری سگی امی تھوڑی ہو گی۔ سوتیلی ہو گی۔ وہ تجھے بہت مارے گی۔ تیری ساری چیزیں چھین لے گی۔ گھر کا سارا کام تجھ سے کرائے گی۔ تجھے کھانے کو بھی کچھ نہ دے گی۔ (عمر پریشان ہو جاتا ہے)

یاسر: تو پریشان ہو گیا ہے؟ ایسی کوئی بات نہیں۔ گھبراؤ نہیں' نئی امی اچھی امی ہو گی۔

عاطف: کیسے اچھی ہو گی؟ سوتیلی ہو گی اور سوتیلی ماں اچھی کب ہوتی ہے؟

یاسر: سوتیلی ماں' اچھی اور بہت اچھی بھی ہوتی ہے۔ عاطف غلط کہتا ہے۔

عاطف: مجھے کیا ضرورت ہے غلط کہنے کی؟

یاسر: اچھا بھئی عمر اب ہم جاتے ہیں اللہ حافظ

(یاسر اور عاطف چلے جاتے ہیں۔ عمر بھالو کو دیکھتا ہے جو بک شیلف پر ہے اور اس سے مخاطب ہوتا ہے)

عمر: بھالو بھیا' عاطف غلط کہتا ہے ناں اور یاسر سچ بولتا ہے ناں۔ نئی امی اچھی ہوتی ہے ناں۔ میری نئی امی اچھی ہو گی ناں؟ وہ نہ مجھے مارے گی نہ تنگ کرے گی اور نہ ہی مجھے بھوکا رکھے گی۔ وہ مجھ سے پیار کرے گی ناں۔ مجھ کو تحفے اور کھلونے لا کر دے گی ناں۔ ہاں بالکل' یاسر ٹھیک کہتا ہے نئی امی اچھی ہو گی۔

(دھوبن آتی ہے۔ وہ کمرے میں چکر لگاتی ہے)

دھوبن: میں آپ کے کپڑے تلاش کر رہی ہوں۔ دھونے والے کپڑے۔ اس کمرے کی صفائی بھی کرنی ہے۔ تمہاری پھپھو نے بتایا ہے کہ تمہاری نئی امی آ رہی ہے۔ ٹھیک ہے یا نہیں؟

عمر: ہاں آ رہی ہیں میری نئی امی' اچھی امی!

دھوبن: نئی امی نہیں سوتیلی امی ہاہائے' برا حال ہو گا تیرا تو

عمر: وہ کیوں؟

دھوبن: وہ سوتیلی ہو گی نا اس لیے۔

عمر: سوتیلی امی نہیں نئی امی۔

(دھوبن کمرے سے چلی جاتی ہے۔ دادی جان آتی ہیں)

دادی: کیا بات ہے عمر' بڑی اونچی آواز میں بول رہے تھے

عمر: کوئی بات نہیں دادی جان وہ آپ بیمار تھیں؟

دادی: میں اب ٹھیک ہوں۔ دوائی پی تھی۔ سنا ہے آپ کے ابا جان کا ٹیلی فون آیا تھا لندن سے؟

عمر: ہاں دادی جان وہ نئی امی لا رہے ہیں میرے لیے۔

دادی: بسم اللہ' بسم اللہ' جی آیا نوں

عمر: دادی جان' نئی امی کیسی ہوتی ہے؟

(دادی کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں)

دادی: بہت اچھی۔ امی تو ہے ہی پیار اور شفقت کا دوسرا نام۔

عمر: مجھے تو عاطف نے ڈرا دیا تھا کہ تمہای ساری چیزیں چھین لے گی۔

دادی: عاطف تو بگڑا ہوا ہے۔ خواہ مخواہ میرے پیارے بچے کو ڈراتا ہے۔ وہ آپ سے چیزیں چھینے گی تھوڑی' وہ تو آپ کے لیے اچھے اچھے کھلونے لے کر آئے گی۔

(دادی اٹھ کر عمر کو پیار کرتی ہیں اور پھر کمرے سے نکل جاتی ہیں۔ عمر پھر بھالو سے باتیں کرنے لگتا ہے)

عمر: دیکھ لو' دادی جان نے بھی کہ دیا کہ نئی امی مجھ سے پیار کرے گی۔

(پڑوس سے عالیہ اور کرن آتی ہیں)

عالیہ: عمر' بھالو سے کیا باتیں کر رہے ہو؟

عمر: میری نئی امی آ رہی ہیں لندن سے' ابا جان لا رہے ہیں۔ میں اس سے اپنی نئی امی کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ جب کمرے میں کوئی نہ ہو تو میں اپنے بھالو بھیا سے باتیں کیا کرتا ہوں

عالیہ: اب تو ہم دونوں بہنیں موجود ہیں۔ ہم سے باتیں کرو۔

عمر: تو کرو

کرن: آپ کی نئی امی جو آ رہی ہیں لندن سے وہ آپ سے پیار کیوں کریں گی؟

عمر: یہ بتاؤ کیوں نہیں کریں گی؟

کرن: اس لیے نہیں کریں گی کہ وہ تو سوتیلی ہوں گی۔

عالیہ: کیا سوتیلی ماں پیار نہیں کرتی؟

کرن: نہیں وہ تو مارتی پیٹتی ہے۔ آپ کی سوتیلی ماں ضرور مار پیٹ کرے گی۔

عالیہ: آپ کی امی سوتیلی ہوگی۔ وہ چڑیل ہو گی۔ ڈائن بن جائے گی تیرے لیے یوں۔

(عالیہ دانت نکال کر، منہ بگاڑ کر اور پنجے آگے کر کے عمر پر جھپٹتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے عالیہ کو دھکا دیتا ہے۔ عالیہ گر جاتی ہے۔ کرن غصے میں آکر عمر کو زور سے دھکا دیتی ہے تو وہ بھی گر جاتا ہے اور اس کا بازو پلنگ کے پائے سے ٹکراتا ہے اور وہ تکلیف سے چیختا چلاتا ہے۔ عالیہ اور کرن بھاگ جاتی ہیں۔ (پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

پردہ اٹھتا ہے تو عمر بستر پر لیٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ زخمی ہے۔ اس کا ایک بازو ٹوٹ گیا ہے۔ اس کے بازو پر سفید پٹی ہے اور چہرے پر تکلیف کے اثرات ہیں۔ وہ سر اٹھاتا ہے تو درد کی تیز لہر دوڑ جاتی ہے اور منہ سے آہ نکلتی ہے۔ اس کے پاس بستر پر ایک خاتون بیٹھی ہے)۔

خاتون: ابھی اٹھنے کی کوشش نہ کرو عمر۔ درد ہو رہا ہوگا۔ کوئی بات نہیں چوٹ لگی ہے بازو پر، آپ دھکا لگنے سے گر پڑے تھے ناں، اس لیے۔

عمر: مجھے کرن نے دھکا دیا تھا۔

خاتون: ہاں، فکر نہ کرو۔ ہم نے کرن کی ماں سے شکایت کی ہے۔ اب وہ اس کی خوب خبر لیں گی۔

عمر: مجھے پیاس لگی ہے۔

خاتون: میں پانی لاتی ہوں بلکہ آپ کو دودھ لا کر دیتی ہوں۔

(خاتون اٹھ کر میز پر سے دودھ کا گلاس لاتی ہے)

عمر: دودھ کو جی نہیں چاہتا، میں پانی پیوں گا

خاتون: دودھ پیو۔ اس میں طاقت ہوتی ہے اور اس سے پیاس بھی بجھ جائے گی۔ لیٹے رہو۔ میں اپنے ہاتھ سے پلاتی ہوں۔ ہلو نہیں۔

(خاتون اپنے ہاتھ سے عمر کو دودھ پلاتی ہے)

عمر: پھپھو کہاں ہیں؟

خاتون: آپ ہسپتال میں ہیں۔ ڈاکٹر ابھی آپ کو دیکھ کر گئے ہیں۔ آپ کی پھپھو گھر پر ہیں۔ آپ کے لیے یخنی تیار کر رہی ہیں۔

عمر: میں تو سوپ پسند کرتا ہوں۔

خاتون: یخنی کو سوپ بھی کہتے ہیں۔ آپ کے لیے چکن سوپ تیار ہو رہا ہے۔

عمر: میں کب سے ہسپتال میں ہوں؟

خاتون: میرے چاند، آپ تین دن سے ہسپتال میں ہیں۔ تین دن بے ہوش رہے ہیں۔ اللہ کے فضل اور ڈاکٹروں کی کوشش سے اب آپ ہوش میں آگئے ہیں۔

عمر: تین دن بے ہوش رہا ہوں؟ مجھے تو اب پتا چلا ہے کہ میں بے ہوش رہا ہوں۔

خاتون: پیارے چاند، زیادہ باتیں نہ کرو۔ لیٹے رہو۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے

عمر: آپ ڈاکٹر ہیں یا نرس؟

خاتون: کہا ہے ناں کہ زیادہ باتیں نہ کرو۔ آرام کرو۔ آپ کو ابھی آرام کی ضرورت ہے۔

(خاتون تھرما میٹر لے کر اس کے منہ میں رکھ دیتی ہے اور انتظار کرنے لگتی ہے۔ پھر تھرما میٹر نکال کر دیکھتی ہے)

خاتون: ہلکا ہلکا بخار ہے اتر جائے گا۔ بازو بھی کچھ دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو ہم اکٹھے چڑیا گھر کی سیر کریں گے۔ عجائب گھر جائیں گے۔ بچوں کی لائبریری میں جا کر دل چسپ کہانیوں کی کتابیں لیں گے۔ آپ کے ساتھ اسکول میں جا کر آپ کی استانیوں سے ملوں گی۔

عمر: ہماری آرٹ کی استانی بہت اچھی ہیں۔

خاتون: اس سے بھی ملاقات ہو گی۔ اب تم سو جاؤ۔ شاباش

(نرس آتی ہے)

خاتون: پہلے سے ٹھیک ہے۔ میں نے دودھ پلا دیا ہے۔ بخار بھی کم ہے آپ اس کا خیال رکھیں۔ میں کچھ دیر بعد آتی ہوں

نرس: جی اچھا (خاتون چلی جاتی ہے)

عمر: کون آیا ہے؟

نرس: میں ہوں نرس (عمر آنکھیں کھول کر بیٹھ جاتا ہے)

عمر: وہ کہاں گئیں؟

نرس: وہ کون؟

عمر: وہی لیڈی ڈاکٹر' اور کون؟

نرس: یہاں تو کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں آئیں۔ آپ کا علاج تو ڈاکٹر جمیل صاحب کر رہے ہیں جو ہڈیوں کے ماہر ہیں اور میں نرس ہوں۔ میں ہی آپ کی پچھلے تین چار دن سے دیکھ بھال کر رہی ہوں۔

عمر: آپ غلط کہتی ہیں۔ میرا علاج اور دیکھ بھال ایک لیڈی ڈاکٹر کر رہی ہیں۔ پیاری ڈاکٹر' وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ اس لیے میں اس کو پیاری ڈاکٹر کہتا ہوں۔

نرس: میرا تو خیال ہے کہ وہ آپ کی ماں ہیں جن کو تم پیاری ڈاکٹر کہتے ہو۔

عمر: میری امی تو اللہ تعالیٰ کے پاس جنت میں ہیں۔ البتہ نئی امی میرے ابو لندن سے لائیں گے اور ابو تو ابھی تک نہیں آئے۔

نرس: لاؤ میں تمہارا ٹمپریچر چیک کروں۔

عمر: نہیں آپ نہیں' میرا ٹمپریچر پیاری ڈاکٹر چیک کریں گی۔

نرس: میں آپ کی پھپھو کو بھیجتی ہوں۔

عمر: وہ کہاں ہیں؟

نرس: وہ آپ کے لیے سوپ گرم کر رہی ہے۔

(نرس چلی جاتی ہے۔ عمر رونے لگتا ہے)

عمر: پتا نہیں پیاری ڈاکٹر کہاں چلی گئی ہیں۔

(پھپھو آتی ہے)

پھپھو: کیا بات ہے عمر رو رہے ہو؟

عمر: پھپھو جان' جو یہاں لیڈی ڈاکٹر تھیں وہ کہاں چلی گئیں۔

پھپھو: یہاں تو کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں تھیں۔

عمر: آپ غلط کہتی ہیں۔ یہاں تھیں میرے پاس۔

پھپھو: وہ لیڈی ڈاکٹر نہیں۔ وہ تو آپ کی نئی امی ہیں۔

عمر: نئی امی؟

پھپھو: ہاں نئی امی۔

عمر: تو ابو کہاں ہیں؟

پھپھو: وہ لندن میں ہیں۔

عمر: تو نئی امی یہاں کیسے آگئیں۔

پھپھو: جہاز سے۔ ہوائی جہاز سے۔

عمر: لیکن کیسے؟

(خاتون آتی ہے)

خاتون: میرے پیارے چاند سے بیٹے' میں بتاتی ہوں کیسے؟ آپ کے ابا جان کو اطلاع ملی۔

پھپھو: میں نے ان کو اطلاع دی تھی۔

خاتون: کہ عمر کو چوٹ آ گئی ہے۔ بازو ٹوٹ گیا ہے۔ انہوں نے فوراً" مجھے ہوائی جہاز کے ذریعے لاہور بھیج دیا۔ وہ خود بھی ضرور آتے لیکن لندن میں ان کو بہت ضروری کام تھا۔ وہ پانچ چھ دن کے بعد آئیں گے۔ میں آپ کی دیکھ بھال کے لیے پہلے آ گئی۔

پھپھو: اب سمجھے' یہ لیڈی ڈاکٹر نہیں آپ کی نئی امی ہیں۔

عمر: میری پیاری امی (عمر خوش ہو کر کہتا ہے)

خاتون: میرا پیارا بیٹا (خاتون بھی مسکراتی ہے)۔

(دونوں گلے ملتے ہیں) پردہ گرتا ہے۔

چودھری رحمت علی

چودھری رحمت علی (مجوّزِ پاکستان)

لفظ پاکستان کے خالق چودھری رحمت علی. طالب علمی کے ابتدائی زمانے ہی سے تحریکِ پاکستان میں دِل چسپی لینے لگے اور اِس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار وقتاً فوقتاً کرتے رہتے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں طالب علمی کے زمانے میں بزمِ شبلی کے افتتاحی خُطبہ 1915ء میں اُنھوں نے کہا کہ شُمالی ہندوستان مُسلم ہے اور ہم نہ صرف اُسے مُسلم رکھیں گے بلکہ اُسے مُسلم ریاست بنا دیں گے 1931ء میں جب کیمرج یُونی وَرسٹی (انگلینڈ) میں زیرِ تعلیم تھے تو اُنھوں نے اپنے ہم جماعتوں محمد اسلم خان، محمد صادق، اور عنایت سے مِل کر گول میز کانفرنس کے موقع پر ہندوستان کی تقسیم کی ایک تجویز پیش کی۔

NOW OR NEVER

(اب یا کبھی نہیں)

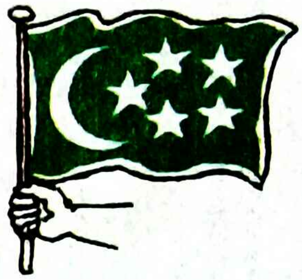

تیسری گول میز کانفرنس (لندن) کے موقع پر چودھری رحمت علی نے اب یا کبھی نہیں (NOW OR NEVER) کے عنوان سے چار صفحات پر مشتمل ایک اعلامیہ جاری کیا۔ جس میں اُنھوں نے تجویز کیا کہ مُسلمان ہندوؤں سے بالکل ایک علیحدہ قوم ہیں لہٰذا مُسلمانوں کے لیے پانچ مُسلم یونٹوں پر مشتمل ایک علیحدہ وفاق قائم کیا جائے۔

اِس اسکیم کے ساتھ شائع ہونے والے نقشے میں سرحد، پنجاب، کشمیر، سندھ اور بلوچستان کو مجوّزہ پاکستان کے علاقے ظاہر کیا گیا۔

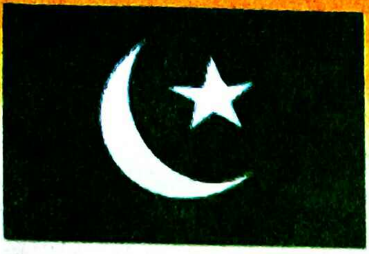

پرچم مسلم لیگ

قائدِاعظمؒ کی سیاست میں واپسی

1934ء

ہندوستان میں 1934ء کے عام انتخاب قریب آ رہے تھے۔ دو گروہوں میں بٹی ہوئی مُسلم لیگ مُتّحد ہو چکی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اسمبلی میں مُسلمانوں کی نمائندگی کا فرض کِس کو سونپا جائے۔ اس وقت کے سیاسی اُفق پر قائدِاعظمؒ کی غیر موجودگی کو تمام باشعور مسلمان محسوس کر رہے تھے اور کامیابی کے لیے لندن سے ان کی واپسی کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ اِس سلسلے میں عبدالمتین چودھری نے قائدِاعظمؒ سے درخواست کی کہ ہندوستان واپس چلیں اور مسلمانوں کی قیادت سنبھالیں۔ چند دیگر مسلمان راہ نماؤں نے بھی قائدِاعظمؒ سے یہی درخواست کی جن میں لیاقت علی خان بھی شامل تھے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی ایک پیغام کے ذریعے قائدِاعظمؒ کو ہندوستان واپس آکر مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کی تجویز پیش کی۔ لیاقت علی خاں نے خود لندن جا کر قائدِاعظمؒ کو اس سلسلے میں صورت حال سے آگاہ کر کے ہندوستان واپس آنے کی دعوت دی۔

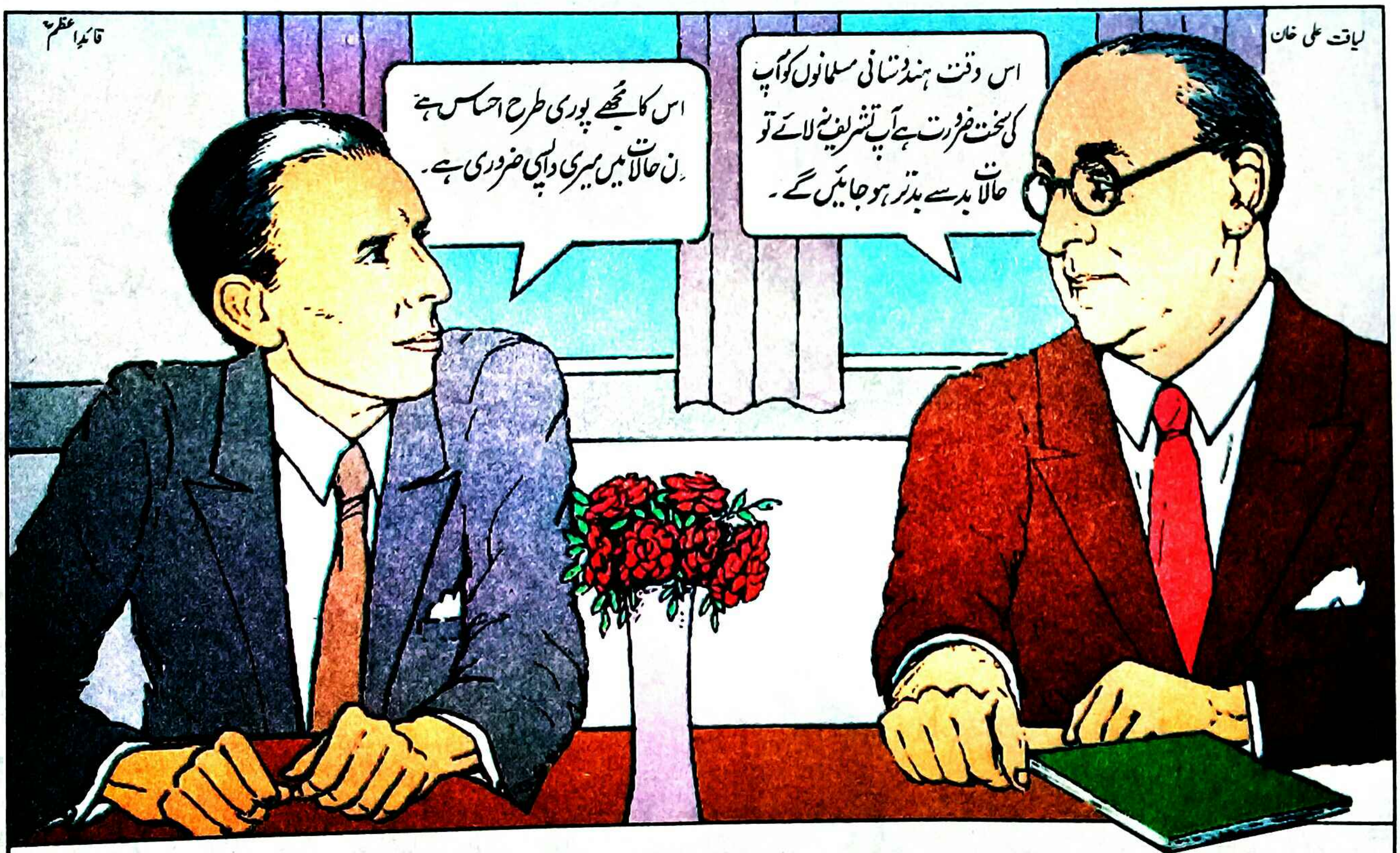

بمبئی میں قائدِاعظمؒ کے حلقۂ انتخاب کے اراکین کی دِلی خواہش تھی کہ وہ منتخب ہو کر مرکزی اسمبلی میں ان کی نمائندگی کریں، چنانچہ 11 اکتوبر 1934ء کو قائدِاعظمؒ بمبئی کے حلقے سے بلامقابلہ مرکزی اسمبلی کے رُکن منتخب ہو گئے۔ جب فروری 1935ء میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس ہوا تو قائدِاعظمؒ نے کمیونل ایوارڈ کے سِلسلے میں اپنے دلائِل پیش کر کے مسلمانوں کے مفاد میں بعض ترامیم منظور کرائیں۔

باقی آئندہ

ماں کا سایہ

حفیظ الرحمان حسن

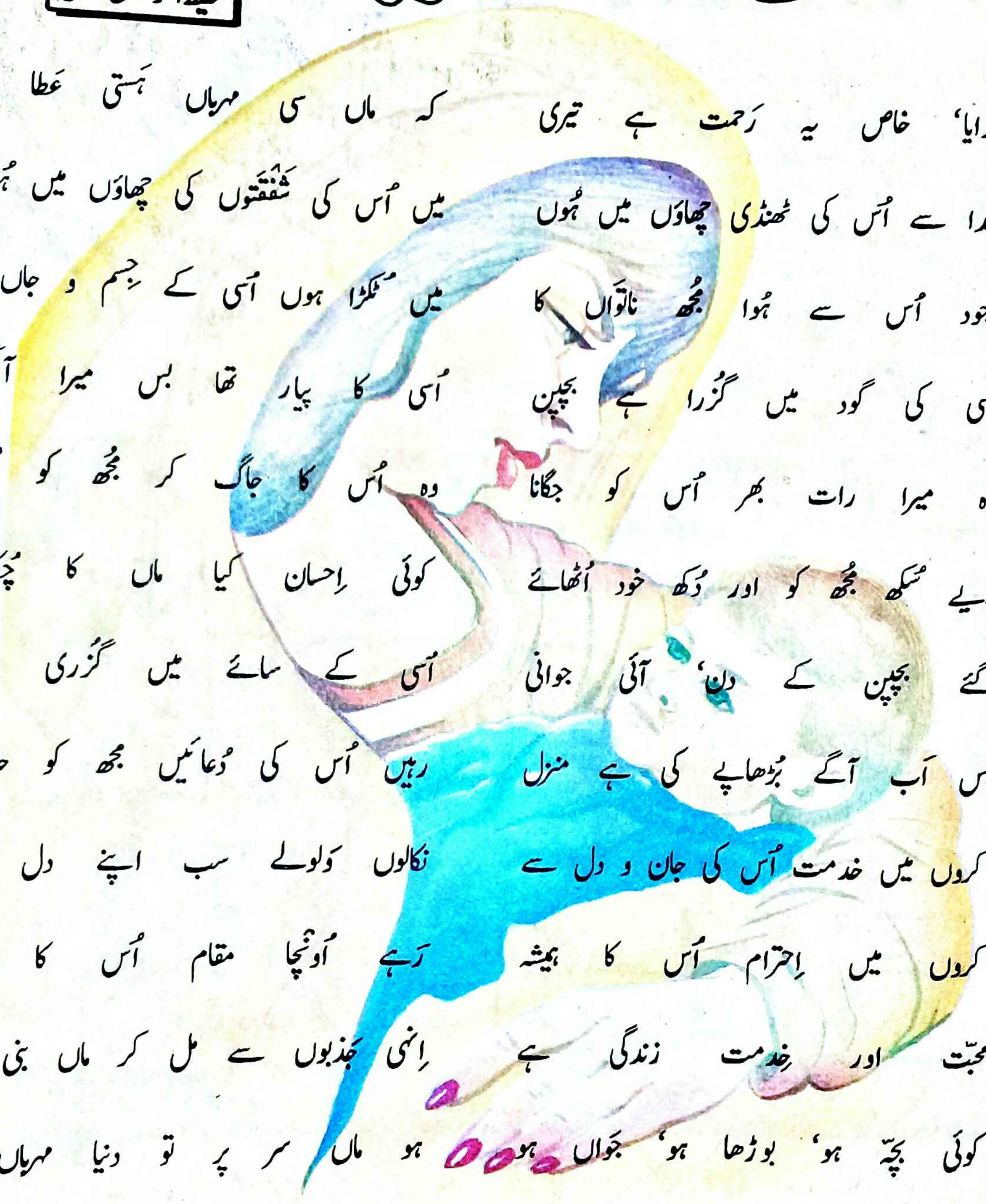

خُدایا، خاص یہ رحمت ہے تیری — کہ ماں سی مہرباں ہستی عطا کی
سدا سے اُس کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہُوں — میں اُس کی شفقتوں کی چھاؤں میں ہُوں
وُجود اُس سے ہُوا مجھ ناتواں کا — میں ٹکڑا ہوں اُسی کے جسم و جاں کا
اُسی کی گود میں گزرا ہے بچپن — اُسی کا پیار تھا بس میرا آنگن
وہ میرا رات بھر اُس کو جگانا — وہ اُس کا جاگ کر مجھ کو سُلانا
دِیے سُکھ مجھ کو اور دکھ خود اُٹھائے — کوئی احسان کیا ماں کا چکائے
گئے بچپن کے دن، آئی جوانی — اُسی کے سائے میں گزری جوانی
بس اب آگے بڑھاپے کی ہے منزل — رہیں اُس کی دُعائیں مجھ کو حاصل
کروں میں خدمت اُس کی جان و دل سے — نکالوں ولولے سب اپنے دل کے
کروں میں احترام اُس کا ہمیشہ — رہے اُونچا مقام اُس کا ہمیشہ
محبّت اور خدمت زندگی ہے — اِنہی جذبوں سے مل کر ماں بنی ہے
کوئی بچّہ ہو، بوڑھا ہو، جواں ہو — ہو ماں سر پر تو دنیا مہرباں ہو
اگرچہ ڈھل رہی ہے عُمر میری — میں اُس کے سامنے بچّہ ہوں اب بھی
اِلٰہی، میرا بچپن زندہ رکھنا! — خُدایا، مجھ پہ ماں کا سایہ رکھنا!

عبدالستار خان طاہر

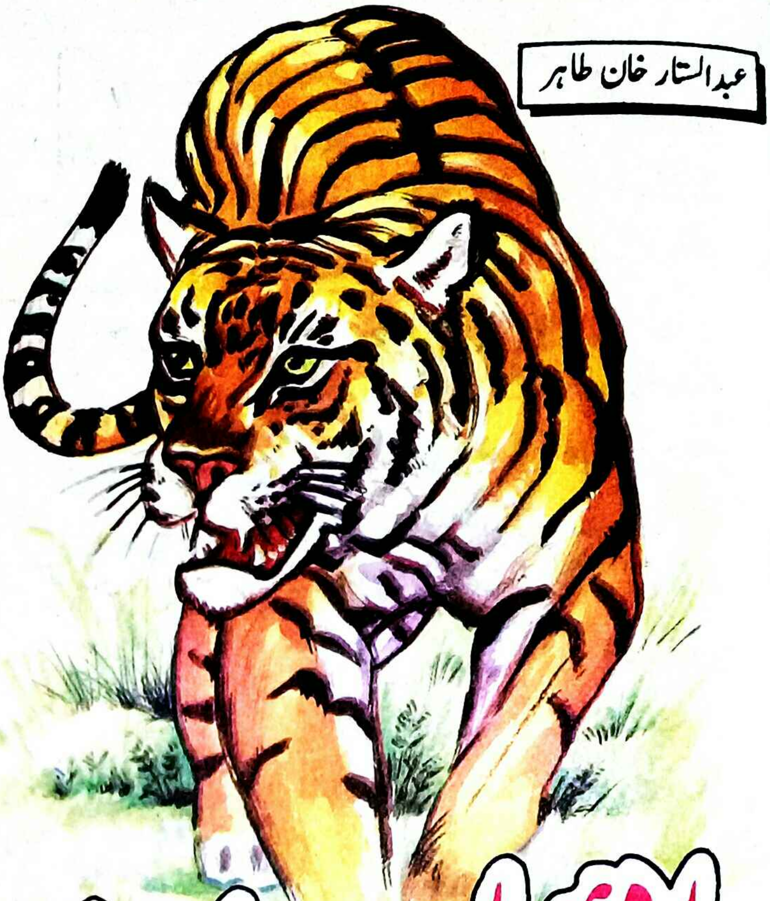

ہائی را اور ماتا

وسطی ہندوستان کے جنگلوں میں رہنے والے انسان سیلابوں' درندوں اور غربت کے رحم و کرم پر زندہ رہتے ہیں- وہ درندوں کی خصلتوں کو اور درندے ان کی خصلتوں کو جانتے ہیں- ان کے درمیان ایک خاموش معاہدہ ہوتا ہے جو کہیں لکھا ہوا نہیں ہوتا- اس کے تحت درندے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں اور انسان اپنی زندگی- کبھی کبھی کوئی شیر یا چیتا کسی مجبوری کے تحت انسانوں کو مار کر کھانا شروع کر دیتا ہے- اس کی مجبوری ایک تو یہ ہوتی ہے کہ وہ بوڑھا ہو جاتا ہے- اس کے دوڑنے کی رفتار کم ہو جاتی ہے- اس کے پنجوں میں گرفت اور جسم میں طاقت نہیں رہتی- اس کے علاوہ اس کے دانت بھی بوسیدہ ہو چکے ہوتے ہیں- دوسری مجبوری یہ ہوتی ہے کہ اس کے خنجروں جیسے ناخنوں میں سے ایک دو ٹوٹ جاتے ہیں- اس طرح اس سے بڑا جانور پکڑا نہیں جاتا- تیسری مجبوری بیماری یا کوئی اور جسمانی کمزوری ہوتی ہے- اس لئے انسان اس کے لئے سب سے آسان شکار ہوتا ہے- کیوں کہ انسان تیز نہیں دوڑ سکتا- جب انسان کے پیچھے شیر دوڑتا ہے تو اس کی دہشت سے انسان کے پاؤں آگے نہیں اٹھ پاتے- ایسے ہی بعض معذور شیر عورت اور بچے کو نہایت آسان شکار سمجھتے ہیں-

وسطی ہندوستان کے جنگلوں میں ایک دھاری دار شیر (جس کو انگریزی میں ٹائیگر کہتے ہیں) تھا- وہ کسی جانور کو نہیں چھوڑتا تھا- بلکہ انسانوں کو بھی چیر پھاڑ کر کھا جاتا تھا- عام خیال یہ تھا کہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے انسان خور ہو گیا ہے- لیکن اسے ہرن' سامبر اور چیتل کے پیچھے دوڑتے ہوئے جنھوں نے دیکھا تھا' وہ کہتے تھے کہ جتنا تیز یہ شیر دوڑتا ہے اتنا تیز جوان شیر بھی نہیں دوڑ سکتا- اس جنگل میں اس کی نسل کے اور بھی کئی شیر تھے- لیکن اسے سب دور سے پہچان لیتے تھے- کیوں کہ یہ بہت بڑا اور لمبا تھا- اس کی لمبائی ناک سے دم تک 11 فٹ 2 انچ تھی- گھاس پھونس کے جھونپڑوں میں رہنے والے' جنگل کے باسیوں نے اس کا نام "ہائی را" رکھ دیا تھا- تجربہ کار بوڑھے کہتے تھے کہ ہائی را پیٹ بھرنے کے لئے جانور یا انسان پر حملہ نہیں کرتا بلکہ انسان کی طرح اس نے شکار کو کھیل یا مشغلہ بنا لیا ہے- اس کی عادتیں عام شیروں سے مختلف تھیں- مثلاً عام طور پر شیر اپنے شکار کو مارتا ہے گھسیٹ کر لے جاتا ہے اور کہیں رکھ دیتا ہے اور پھر رات کو آکر اسے کھاتا ہے- لیکن "ہائی را" جہاں شکار کو مارتا تھا وہیں کھانا شروع کر دیتا تھا- وہ جھونپڑوں کے چھوٹے سے گاؤں میں دن دہاڑے آجاتا اور ٹہلتا ٹہلتا گزر جاتا تھا- شیروں کی یہ خصلت ہے کہ وہ بھوکے نہ ہوں تو کسی پر حملہ نہیں کرتے- انسانوں اور جانوروں کے قریب سے گزر جاتے ہیں- لیکن ہائی را بھوکا نہ بھی ہوتا تو بھی شکار کھیلتا تھا- جنگل کے رہنے والے غریب لوگ اسے سراپا موت کہا کرتے تھے-

یہ ایک مٹی کی دیواروں اور گھاس پھونس کے جھونپڑوں کا گاؤں تھا- ہندوستان کے جنگلوں میں کہیں کہیں

ایسے گاؤں پائے جاتے ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ یہ گاؤں زمین پر ابھرتے ہیں اور کچھ عرصے بعد غائب ہو جاتے ہیں۔ جو دریا کے قریب ہوتے ہیں۔ انہیں سیلاب بہا لے جاتا ہے اور جو دریا سے دور ہوتے ہیں انہیں کوئی انسان خور درندہ یا قحط خالی کرا دیتا ہے۔

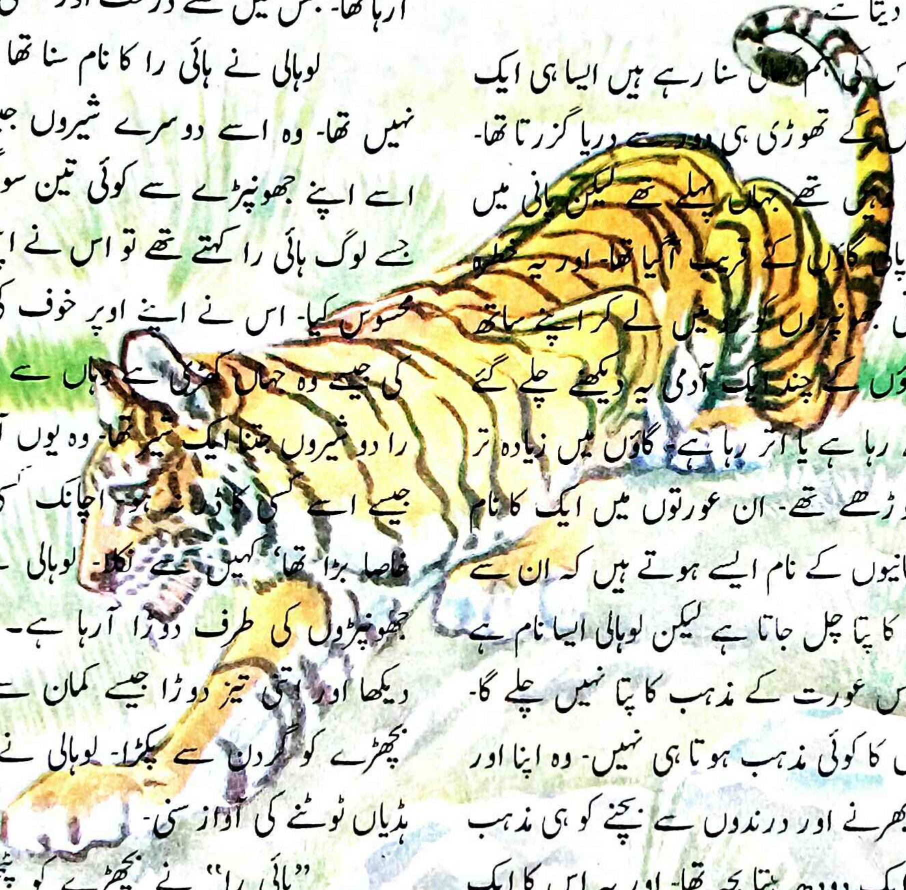

وہ گاؤں جس کی ہم کہانی سنا رہے ہیں ایسا ہی ایک گم نام گاؤں تھا۔ اس کے تھوڑی ہی دور سے دریا گزرتا تھا۔ دریا کے کنارے تو وہیں تھے جہاں پہلے تھے لیکن پانی میں ڈوب گئے تھے اور پانی گاؤں کے قریب آگیا تھا۔ اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ پانی جھونپڑوں کو بھی لپیٹ میں لے کر اپنے ساتھ بہا لے جائے گا۔ گاؤں کے چند ایک آدمی یہ دیکھنے چلے گئے تھے کہ سیلاب چڑھ رہا ہے یا اتر رہا ہے۔ گاؤں میں زیادہ تر عورتیں بچے اور بوڑھے تھے۔ ان عورتوں میں ایک کا نام "لوہالی" تھا۔ ہندوستانیوں کے نام ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے ہر ایک کے مذہب کا پتا چل جاتا ہے لیکن لوہالی ایسا نام ہے جس سے آپ کو اس عورت کے مذہب کا پتا نہیں چلے گا۔ اصل میں ان لوگوں کا کوئی مذہب ہوتا ہی نہیں۔ وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے اور درندوں سے بچنے کو ہی مذہب سمجھتے ہیں۔ لوہالی کا ایک دودھ پیتا بچہ تھا۔ اور یہ اس کا ایک ہی بچہ تھا۔ لوہالی کا خاوند بھی ان آدمیوں کے ساتھ چلا گیا تھا جو یہ دیکھنے گئے تھے کہ سیلاب چڑھ رہا ہے یا اتر رہا ہے۔ اگر سیلاب چڑھنے کا خطرہ ہے تو جھونپڑے اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے جائیں۔ لوہالی اپنے جھونپڑے کے باہر بیٹھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔

اچانک اسے عورتوں اور بچوں کا شور سنائی دیا۔ "ہائی را .... ہائی را آگیا"۔ ہر کسی پر دہشت چھائی ہوئی تھی۔ لوگوں نے اپنے جھونپڑوں کے دروازے مضبوطی سے بند کر لئے تھے۔ گلیوں اور بازاروں میں خوف کا راج تھا۔ لوہالی نے اپنے بچے کو سینے سے لگا لیا اور اپنے جھونپڑے کے دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ یہ درختوں کی ٹہنیوں اور گھاس پھونس کا کواڑ تھا۔ جس کی نہ چٹخنی تھی نہ زنجیر۔ لوہالی نے کواڑ کو ذرا سا کھلا رکھا اور باہر دیکھتی رہی۔ وہ لوگوں کے بھاگتے دوڑتے قدموں کی آہٹ سے محسوس کر رہی تھی کہ سب لوگ اپنے اپنے جھونپڑوں میں چلے گئے ہیں۔ ذرا سے کھلے ہوئے کواڑ میں اسے اپنے سامنے وسیع و عریض میدان نظر آرہا تھا۔ جس میں گھنے درخت اور جنگلی گھاس اگی ہوئی تھی۔

لوہالی نے ہائی را کا نام سنا تھا لیکن اسے دیکھا کبھی نہیں تھا۔ وہ اسے دوسرے شیروں جیسا سمجھتی تھی۔ لیکن اسے اپنے جھونپڑے سے کوئی تین سو گز دور یہ شیر نظر آیا جسے لوگ ہائی را کہتے تھے تو اس نے اپنی سانسوں کو رکتا ہوا محسوس کیا۔ اس نے اپنے اوپر خوف کی ایسی گرفت محسوس کی جیسے وہ جہاں کھڑی ہے وہاں سے ہل نہیں سکے گی۔ ہائی را دو شیروں جتنا ایک شیر تھا۔ وہ یوں آہستہ آہستہ چلا آرہا تھا جیسے اسے کسی کا ڈر نہ ہو۔ اچانک کسی کی گائے کا بچھڑا جو خاصا بڑا تھا، کہیں سے نکلا۔ لوہالی نے اسے دیکھا کہ وہ جھونپڑوں کی طرف دوڑا آرہا ہے۔ ہالی را نے بھی اسے دیکھا اور اتنی تیز دوڑا جیسے کمان سے تیر نکلا ہو۔ اس نے بچھڑے کو گردن سے پکڑا۔ لوہالی نے بچھڑے کی گردن کی ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز سنی۔

"ہائی را" نے بچھڑے کو پٹخنی دی۔ جنگل کی ہری بھری گھاس کا پلا ہوا بچھڑا یوں گرا جیسے مکھی مرتی ہے۔ ہائی را وہیں بیٹھ گیا اور اسے کھانے لگا۔ وہ کچھ دیر بعد سر اٹھاتا اور جھونپڑوں کی طرف دیکھتا۔ لوہالی نے اپنے بچے کو سینے اور بازوؤں میں چھپا رکھا تھا۔ وہ خوف سے کانپنے لگی۔ ہائی را کی دہشت سے اسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے نظریں شیر پر رکھیں۔ گدھ اترنے لگے تھے اور وہ ہائی را کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ قریبی درختوں پر بیٹھ گئے تھے۔ جنگل میں گدھوں اور شیر کا ساتھ ہوتا ہے۔ شیر جدھر جاتا ہے گدھ ادھر کو اڑتے اور اوپر چکر لگاتے رہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ شیر کسی جانور کو مارے گا تو انہیں بھی کھانے کو کچھ مل جائے گا۔

کچھ دیر بعد ہائی را نے بچھڑے کی ہڈیوں کا ڈھانچہ

اتار دی۔ شیر دھاڑ کر پیچھے ہٹا۔ لوہالی اس کے پہلو سے برچھی نکال نہ سکی۔ اس نے لپک کر کواڑ بند کر دیا اور اپنے سوئے ہوئے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

اب رات کے سناٹے میں باہر سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے دو شیر آپس میں لڑ رہے ہوں۔ لیکن وہ لڑتے ہوئے شیر نہیں تھے بلکہ اکیلا ہائی را تھا۔ برچھی اس کی پسلیوں میں سے گزر کر پھیپھڑوں تک چلی گئی تھی۔ وہ لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔ برچھی ٹوٹ گئی تھی لیکن اس کے جسم میں گیا ہوا برچھی کا حصہ اس کے جسم میں ہی تھا۔ شیر اتنی جلدی مرا نہیں کرتا۔ بلکہ گولی کھا کر بھی حملہ کرتا اور دھاڑتا ہے۔ البتہ اگر گولی دل میں لگے یا دماغ میں تو جلدی مر جاتا ہے۔ لوہالی نے ساری رات کانپتے ہوئے گزاری۔ شاید وہ کچھ دیر کے لئے بے ہوش ہو گئی تھی۔ جب صبح ہوئی تو لوہالی اور جھونپڑوں میں جو لوگ رہ گئے تھے۔ انہوں نے باہر نکل کر دیکھا۔ ہائی را باہر مرا پڑا تھا۔ وہ ڈر کے مارے اس کے قریب نہیں جا رہے تھے۔

میں جنگل کے کھوجیوں اور رائفل برداروں کے ساتھ ہائی را کی تلاش میں تیسرے دن وہاں پہنچا۔ تب بھی ہائی را وہیں پڑا تھا۔ گدھوں نے جو اس کا مارا ہوا شکار کھایا کرتے تھے' اسے آدھا کھالیا تھا۔ اور باقی کے حصے کو کھا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ برچھی اس کے دائیں پھیپھڑے میں اتری ہوئی تھی۔ خون نے اس کا یہ پھیپھڑا بھر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ہائی را سانس نہ لے سکا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

ماں کی ممتا جیت گئی تھی اور شیر کی دہشت ہار گئی تھی۔ میں کبھی اس خون خوار اور طاقت ور مردہ شیر کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی اس کمزور ماں کی طرف' اور سوچ رہا تھا کہ خدا نے جو ماں کے قدموں تلے جنت رکھی ہے تو اس کی انہی خوبیوں کی وجہ سے رکھی ہے کہ وہ اپنی طاقت اور صلاحیت سے بڑھ کر اپنی اولاد کی نگہ داشت کرتی ہے (ول جن کنز کی کہانی سے ماخوذ)

Latest and largest variety Unbeatable price IBM CDs

FUTURE ZONE GAMES WORLD

SUNDAY OPEN

Computer & Video Games

(IBM GAMES CDs)

Sony Play station-Panasonic 3Do (Sega Saturn, Sega) Mega Drive, super nintendo, nintendo 64 family computer, cassettes and CDs available. Exchange your cassettes. We are an established shop with thousands of satisfied customers.

Future Zone

Palace Arcade Near Police Station
Liberty, Lahore 5764245 - 5764246

Kiran Electronic,

Hall Road 7220078-7230078

بلاعنوان

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتابیں لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 7 اپریل 1998ء

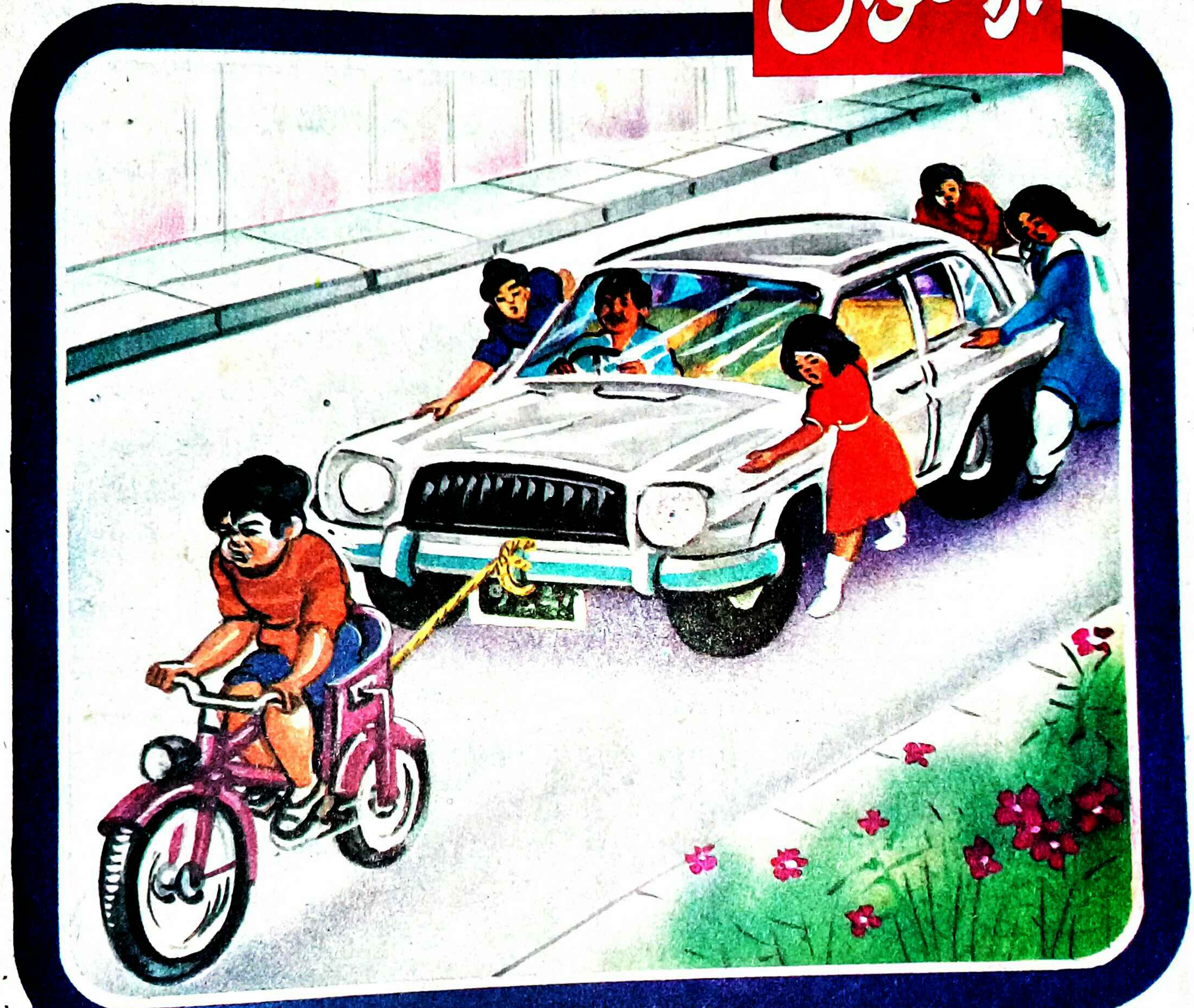

مارچ 1998ء کے بلاعنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو چھ عنوان پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کئے ان میں سے یہ چھ ساتھی انعام کے حق دار قرار پائے۔

- قرۃ العین 'لاہور (کھلاڑی میدان میں ریفری آرام میں 'پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)
- ثنا عباس 'چکلالہ (ایک سے بڑھ کر ایک 'دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)
- سلمان رشید سنی 'سرگودھا (چوسنی ٹیبل ٹینس 'تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)
- عطرت نسیم 'ملتان (ممتا کے سنگ 'چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)
- شجاع عباس 'راول پنڈی (جو جیتا سو یٹرا سکا 'پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)
- عمار اکرم 'فیصل آباد (منے بنے کھلاڑی 'چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)

...KISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں اور نظمیں سب آپ کے لیے

یہ کتابیں خود بھی پڑھیے
اپنے عزیزوں اور قریبی دوستوں کو
تحفے کے طور پر بھی دیجیے۔

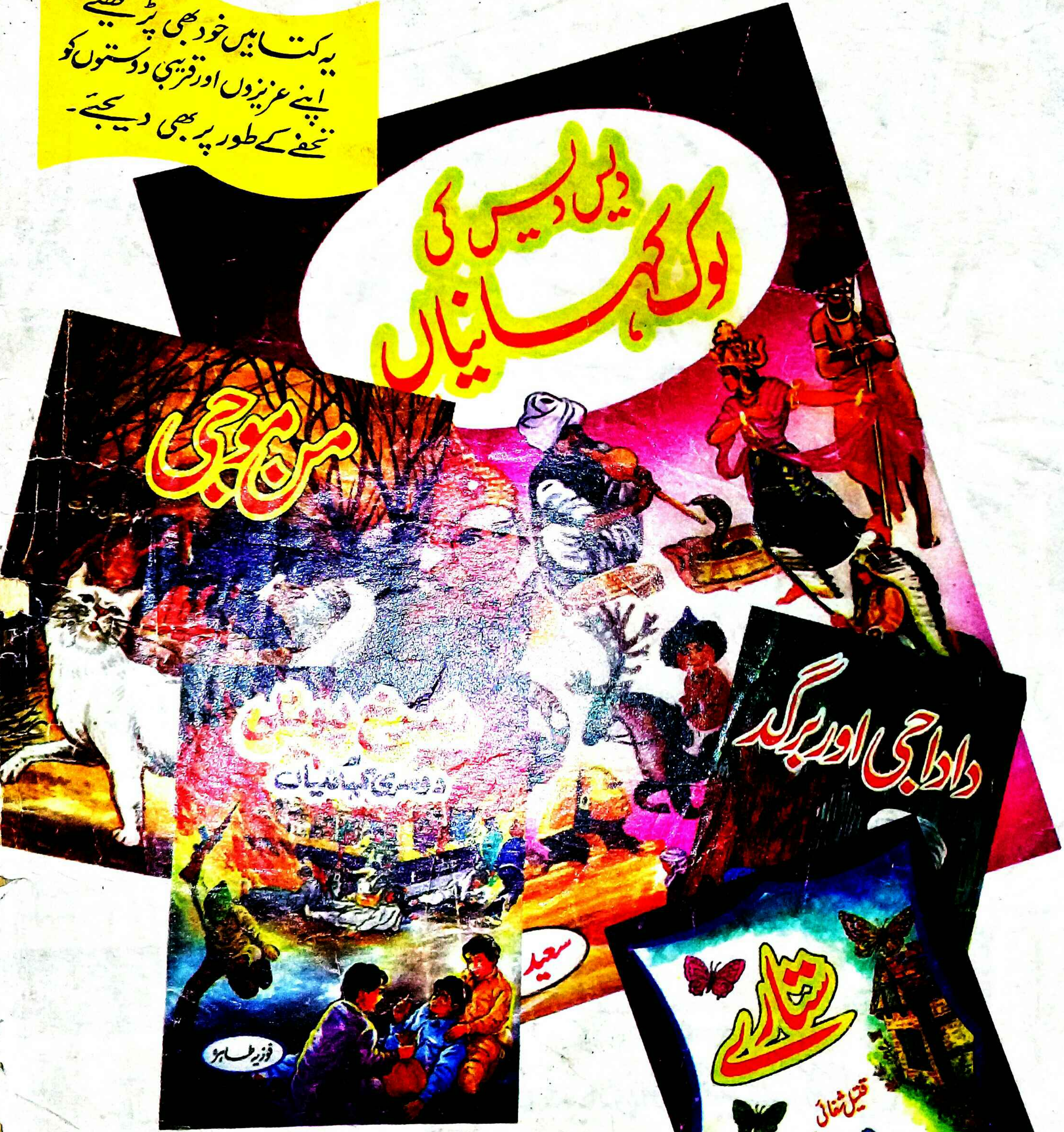

مزید کتابیں
دیکھنے کے لیے ہمارے
شوروموں میں
تشریف لائیں

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی